ماہنامہ

ترجمان القرآن

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اچھرہ، لاہور (پاکستان)

سید ابوالاعلیٰ مودودی

کی

اوّلین تصنیف

الجہاد فی الاسلام

- ○ جو کہ ۲۳ سال کی عمر میں تحریر کی گئی۔
- ● جس کی علامہ اقبال نے بھی تعریف و تحسین فرمائی۔
- ○ جسے تحریک قیام پاکستان کے دوران میں مسلمانوں میں جذبۂ جہاد پیدا کرنے کے لیے کثیر تعداد میں پھیلایا گیا۔
- ● اسلام کے نظریۂ جہاد اور قانون صلح و جنگ کی بہترین اور مکمل تصویر۔
- ○ دیگر مذاہب و اقوام عالم کے جنگی مقاصد و نظریات۔

ـــ اور ـــ

- ● بین الاقوامی قوانین قتال کا تقابلی مطالعہ
- ○ اسلامی قواعد جہاد کی برتری کے تفصیلی دلائل
- ● جہاد کے مخالفین و معترضین کو مسکت جواب
- ○ درجنوں کتب و دستاویزات کے مطالعہ کا نچوڑ

۶۰۰ صفحات ○ قیمت مجلد ـــ ۶۵/- روپے

اِدارہ ترجمان القرآن

اچھرہ ○ لاہور

ماہنامہ ترجمان القرآن

جاری کردہ:

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اچھرہ، لاہور (پاکستان)

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

رجسٹرڈ نمبر ایل: ۵۳۴۰

جلد ۱۱۳ جولائی ۱۹۹۰ء ذوالحجہ ۱۴۱۰ھ عدد ۵

رابطہ و ترسیلِ زر کے لیے: ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ۔ رحمٰن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

فون نمبر: ۶۸۶۳۶ - ۳۲۴۴۶۸ پوسٹ بکس نمبر: ۱۴۴۳

فی پرچہ: ۶ روپے زرِ سالانہ: ۶۰ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

شریعت بل کے خلاف حکومتی تحریکِ مخالفت!
نسوانی جمہوریت کے ماتھے کا جڑاؤ زیور!
اہلِ پاکستان کے لیے قوتِ شر کا تمغۂ مرگِ غیرت!

لیجیے! نفاذِ شریعت کا راستہ روکنے کے لیے خود حکومت میدان میں آگئی۔

یہ حکومت جس نے جمہوریت کی مالا کا جاپ کرتے ہوئے اب تک قوم کو خیانت، خون خرابے، مالی تباہی، ٹیکسوں اور مہنگائی کے نت نئے ردّوں کے سوا کچھ نہیں دیا، وہ اب کسی پھنیر سانپ کی طرح اپنا پھن اٹھا کر پھنکارتی ہوئی نفاذِ شریعت کا راستہ روک کر کھڑی ہوگئی ہے۔ شریعت بل وہ کلید ہے جس سے ہمارے موجودہ و مروجہ دستوری و قانونی سسٹم میں قانونِ الٰہی کے نفاذ کا راستہ کھلتا ہے۔ وہ جو کہا جاتا ہے کہ ہم شریعت کے مخالف نہیں، ہم تو شریعت بل کے مخالف ہیں، تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہم ریل گاڑی کے مخالف نہیں ہیں، بس ہم اس کے لیے پٹڑی بچھانے کے خلاف ہیں۔ انسان جب آفتاب جیسی کسی حقیقت کا انکار کرنے پر تل جاتا ہے تو وہ اپنے حق میں استدلال کے لیے ایسے ایسے تارے آسمان سے توڑ لاتا ہے، بلکہ کبھی تو پورے نظامِ کہکشانی کو کھینچ کر فرشِ پا بنا لیتا ہے۔ آج "میں نہ مانوں" کا یہ تماشا ہم اپنی چشمِ سر سے دیکھ رہے ہیں۔

نفاذِ شریعت (اور بنیاد پرستی) کے خلاف امریکہ، برطانیہ، اسرائیل، روس،

کابل اور بھارت سب ہماری حکومت کی پشت پر ہیں۔

صورت اگر یہ ہوتی کہ مخالفت نفاذِ شریعت کے لیے کچھ لادینیت پسند، کچھ آوارہ مزاج، کچھ بیماریٔ تفرقہ کے جذامی، کچھ ماہرینِ خیانت اور کچھ قاتل اور ڈاکو اور مجرم لوگ ازخود شریعت بل کے خلاف میدانِ سیاست میں جنگی کارروائی کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے تو ہم دیکھتے کہ اس قوم کے اربابِ الحاد اور مغرب پرستوں، اور منافقت کے فن کاروں اور فروختنی گھوڑوں اور گھوڑیوں کا تناسب کیا ہے۔ اور ہم دیکھتے کہ یہ قوم اُن سے کیسے نمٹتی ہے۔ مگر اب تو عجیب و غریب صورت حالات پیدا ہوگئی ہے کہ عوامی سیاسی بازی گری کی ڈائرکٹرشپ خود سنبھال لی ہے۔ یعنی پہلے جس بے ضمیر آدمی میں اتنی جرأت پیدا نہ ہوتی کہ وہ حرکت میں آتا۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ وہ کوئی حرکت مذبوحی نہ کرتا، مگر اب اُسے اقتدار خود آواز دے رہا ہے کہ اُٹھو، اور اس کی منافقت میں دس گنا زیادہ جسارت پیدا ہوگئی ہے۔ اب تو حکومت نے خود عوام یا اپنی پارٹی کے لوگوں کو نہیں بلکہ محکمۂ مذہبی اُمور کے نام حکم جاری کیا ہے کہ وہ شریعت بل کے خلاف تحریک اُٹھوائے۔ محکمۂ مذہبی اُمور کے بھاگ بھی جاگے کہ اور تو جمہوری دور میں اس سے خدمتِ دین کا کوئی کام سرانجام نہ پاسکا۔ اب بے حرکت پڑی ہوئی مشین کو اُلٹا چلا دیا گیا ہے کہ وہ دین کی سربلندی کی سیاسی، قانونی، علمی، فکری اور سماجی کوئی خدمت کرنے کے بجائے غلبۂ دین کے لیے جو اوّلین قدم قراردادِ مقاصد کے عین موافق اور قائداعظمؒ اور اقبالؒ کی قوم کے ولولۂ ایمانی کے عین مطابق شریعت بل کی شکل میں اُٹھایا جارہا ہے۔ اسے روکنے کے لیے مزاحمتی تحریک چلانے کے انتظامات کرے۔ کیا ہماری حکومت محکمۂ مذہبی اُمور کو ان حکمرانوں کی طرح استعمال کرنا چاہتی ہے جنھوں نے امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ اور امام احمد بن حنبلؒ اور امام تیمیہؒ کی خاموش علمی تحریکوں کے خلاف جیل کی زنجیریں اور کوڑے استعمال کیے۔ یا کیا وہ اکبری دور کے خواب میں گم ہوکر نام نہاد علماء سے حقیقی علماء کا جادۂ اقامتِ دین رکوانا چاہتی ہے۔ کیا اُسے معلوم ہے کہ مجدد الف ثانیؒ کے خلاف اقتدار نے کیا کیا۔ اور اس کا جواب قدرت نے کیا دیا۔ اس کا

جواب اورنگ زیب عالمگیر تھا جس نے اکبر بادشاہ کے ہر نشان کو محو کر کے چھوڑا۔
محکمہ مذہبی امور کے نام باقاعدہ فرمان جاری ہوا ہے (ملاحظہ ہو اخبار جنگ، مورخہ ۱۶ جولائی ۱۹۹۰ء) کہ محکمہ شریعت بل کے مخالفین کو (تلاش کر کر کے) آگے لائے، ماڈرن خواتین (میری تجویز ہے کہ مخالفِ شریعت جمہوری مظاہروں میں طوائفوں کو بھی استعمال کرنا چاہیے — راقم) پیپلز پارٹی کے وکلا، اور (نورانی میاں کی شاندار قیادت میں) علماء کو (اچھا ہے وہ نام دھاری ہوں یا زرخرید — راقم) احتجاجی مظاہروں کے لیے اُکسا کر وفاقی ایوان تک لایا جائے۔ علماء کے علاوہ پیروں ("پیرانِ پارسا" — راقم) مذہبی تنظیموں اور خواتین تنظیموں سے اخبارات میں شریعت بل کے خلاف بیانات اور اشتہارات دلوائے جائیں۔ بار ایسوسی ایشنوں میں قرار دادیں منظور کرائی جائیں۔
افسوس کہ ہماری حکومت میں جبر و مکر اور غل وغش کی ارواحِ بد گھس گئی ہیں۔
اُوپر جو کچھ عرض کیا گیا ہے، سخت قابلِ مذمت اور قابلِ نفرین ہے۔ ہماری بدبختیٔ اعمال اور شومیٔ قسمت کہ ہمارے یہاں جمہوری قبا میں نہ جانے استبداد کا کوئی دیو ناچ رہا ہے یا کوئی سحر طراز چڑیل۔
جمہوری لحاظ سے پہلا سوال یہ ہے کہ جب فضا میں کسی طرف سے سیاسی مظاہروں کی ہل چل موجود نہیں، کیونکہ سندھ، حیدرآباد، کراچی، انسانی جانوں، خون اور آبروؤں کی تباہی کو بے احساس کٹھ پتلیوں اور جاندار وحشی روبوٹوں نے جس طرح روز کا تماشا بنا رکھا ہے اس کے صدمے نے لوگوں کو سُن کر دیا ہے۔ اُوپر سے دشمن کی تلوار سروں پر لٹک رہی ہے، معاشرے کے حالات عذابِ الٰہی کا اندیشہ دلاتے ہیں۔ ایسے میں قوم ملک گیر مظاہروں کا مذاق اس وقت نہیں رکھتی ہے۔ افغانستان کے احوال کی خرابی اور کشمیری مجاہدین کے بارے میں بین الاقوامی ڈپلومیسی کے دائرے میں ناکامی کی ذمہ دار حکومت جو حال ہی میں اسلامی اور پاکستانی نقطۂ نظر سے نظامِ تعلیم کی تباہی کا منصوبہ اپنے پُشت بانوں سے قبول کر کے اس پر عملی کارروائی شروع کر چکی ہے۔ اب لے دے کے اس کے لیے اِن حالات میں یہی کام رہ گیا ہے کہ شریعت بل

کے خلاف مظاہرے کرائے۔

دوسری گذارش ہم یہ کرنا چاہتے ہیں کہ چاہیے یہ تھا کہ حکومت جمہوریت کے احترام میں اس معروفِ عام اور عرصہ سے زیرِ بحث رہنے والے بل کو جو سینٹ کے ایوان سے پاس ہو کر آگیا ہے، زیریں وفاقی ایوان میں پیش کر کے دونوں کی آراء اور دلائل کو بھی سنتی، مختلف تعلیمی و دینی ادارات، اخباری دانشوروں، تعلیمی ماہرین، وکلا کی انجمنوں سے اس کے متعلق رائے بھی سامنے کے ساتھ طلب کر لیتی، نیز از خود بھی یہ مسئلہ ایوان میں آنے کے بعد اخبارات اور جلسوں میں زیرِ بحث آتا — پھر آخر کسی ہنگامہ آرائی کی ضرورت ایک ایسی حکومت کو کیا تھی جس کے ساتھ اکثریت ہے، اور جس کے پاس قوم کا مینڈیٹ ہے (چاہے کتنے فی صد ہو)۔

تیسری اہم بات یہ ہے کہ حکومت کے لیے بہترین راستہ یہ تھا کہ وہ خود ایک شریعت بل لاتی جو قرآن و سنت کے تقاضوں سے زیادہ اقرب ہوتا اور قرار دادِ مقاصد کے زیادہ مطابق اور تحریکِ پاکستان اور دیگر دینی تحریکات کے ملنے والوں کے دینی رجحانات کا زیادہ آئینہ دار ہوتا۔

پھر ایوان کے اراکین اور قوم کے عوام یہ دیکھ لیتے کہ پلڑا کدھر بھاری ہے۔
صداقت و دیانت کی اس راہ کو چھوڑ کر اور اپنے ایوانوں کو، اور ایوانوں کے اندر اپنے آپ کو کمزور پا کر یہ بچگانہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ خود حکومت ہی کی مشینری سے تقاضا کیا گیا ہے کہ وہ شریعت بل کی مخالفت کی تحریک اور اس کے مظاہروں کے انتظامات کرے۔

چوتھی شکایت ہمیں یہ ہے (اور اس کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے) کہ حکومت کو حکومت کی مسند سے بات کرنے کے بجائے، پیپلز پارٹی کی چیئرپرسن کو اپنی پارٹی سے یہ بات کرنی چاہیے تھی کہ وہ کسی سیاسی تحریک اور مظاہراتی سرگرمی کا آغاز کرے۔ یہ کام بھی اگر چپکے سے اندر ہی اندر کر لیا جاتا تو بہتر ہوتا۔ لیکن حکومت کی کرسی سے ایک سرکاری محکمے کو ایسے کام کے لیے حکم دینا گویا سرکاری مشینری کو سیاست کے چکر میں

ڈالنا ہے۔ حالانکہ سرکاری محکمے یا افسر یا ملازم نہ تو کسی پارٹی کے غلام ہوتے ہیں اور نہ ان کا سیاسی استعمال جائز ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ آپ قلم چلانے والے شریف، دیانت دار اور انصاف پسند افسر کو یہ حکم دیں کہ کل سے آپ قلم کی جگہ ڈنڈا اور کاغذ کی جگہ پارٹی کا جھنڈا لے کر میدان میں کھڑے ہوں۔

جناب والا! یہ حکومت چلانے کے طریقے نہیں ہوتے، بلکہ حکومت کی مشینری کے ہر پرزے اور پینچ کو خراب اور تباہ کر دینے کے انداز ہیں۔ ہمیں ایسے نقصانات پہلے بھی بہت پہنچے، مگر سرکارِ جمہوریت نے تو حد ہی کر دی۔

محکمہ مذہبی امور کا یہ کام بہر حال نہیں کہ وہ محکمہ لامذہبی امور میں بدل جائے۔ ایسا ہوا تو آئندہ اس کی کوئی دینی اہمیت نہیں رہے گی۔ اگر اس کے افسران میں دین و شریعت سے وفاداری موجود ہے تو وہ کسی مخالف دین و شریعت تحریک کے لیے اپنی خدمات ضمیر زندہ کے ساتھ پیش نہیں کر سکتے۔ ان کی وفاداری پاکستان سے ہے، دستور (اور قراردادِ مقاصد) سے ہے اور ان کی وفاداری بنیادی ضابطۂ ملازمت سے ہے۔

پانچواں نکتۂ توجہ یہ ہے کہ حکومت یا ایوان کے پروگراموں یا فیصلوں کے خلاف اگر کوئی مظاہرہ احتجاج ہو تو اب تک کی روایت یہ رہی ہے کہ اول تو مظاہرین یا مطالبہ کرنے والوں کو اسلام آباد میں گھسنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ بلکہ پہلے ہی لاٹھی، گیس، گولی سے تواضع شروع ہو جاتی ہے۔ ستم یہ کہ اب اپنی ضرورت سے حکومت خود جلوسوں کو ایوان تک آنے اور ہنگامہ مچانے کی دعوت دے رہی ہے۔ یعنی یہ ایک مصنوعی گھریلو ڈرامہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر دوسرے نقطہ نظر کے کثیر التعداد علمبرداروں کے جلوس اور مظاہرے ہوئے تو کیا ان کو بھی حکومت ویسے ہی مواقع اور آسانیاں دے گی؟ اگر نہ دے گی تو وہ غیر جانب دار حکومت نہیں ہے۔ لہٰذا اس کے لیے انصاف کرنا ممکن نہیں۔ اور جو حکومت جانب دار ہو اور انصاف نہ کر سکے وہ جمہوری تو ہرگز نہیں ہو سکتی، الٹا مسئلہ یہ ہے کہ ایسی حالت میں اسے حکومت کرنے کا حق بھی حاصل نہیں۔ جہاں تک ہماری یادداشت کا تعلق ہے وہ قوم یا دین سے اب تک

کسی بڑے معاملے میں انصاف نہیں کر سکی۔ آخر شریعت بل کے مسئلے میں کیسے انصاف کرے گی جو اس کے لیے "گل گھوٹو" سے کم نہیں ہے۔

چھٹی گذارش یہ ہے کہ ان غیر جماعتی اور غیر منظم اور نامعلوم افراد کے ہجوموں میں لازماً قادیانی شریک ہوں گے (کیونکہ وہ نفاذِ شریعت کے مخالف ہیں۔ راقم) شیعہ اور اسماعیلی ضرور شریک ہوں گے، کیونکہ وہ پہلے بھی اس بل کی مخالفت اس بنا پر کرتے رہے ہیں کہ فقہ جعفریہ کے علاوہ ہم اسے قبول نہیں کرتے۔ حالانکہ ایران میں سنّی اقلیت کو سنّی قانون تو کجا کوئی مسجد تک حاصل نہیں ہے۔ ہمارے پاس رپورٹ موصول ہوئی، مگر ایرانی زلزلے کی وجہ سے ہم نے شائع نہیں کی۔ اس طوفان میں سیکولرازم کے مومنین قانتین، مغربیت کی فاسقانہ معاشرت کی ہیروئن کے سرمست، مال وجاہ کی مہرہ بازی کے مناظر، غیر مسلم اقلیتیں (جو واضح طور پر سیکولرازم کو ترجیح دیتی ہیں)۔ بلکہ کون تردید کر سکتا ہے کہ اس میں صہیونی ("موساد" کے آدمی) ہندو "را" کے آدمی) کابل سے لے کے بی بی سی کے آدمی، اور فنڈا منٹلزم کے خلاف ہر چال چل سکنے والے امریکہ کی طرف سے سی آئی اے کے آدمی اس میں شریک نہیں ہوں گے۔ پھر خواتین کے نام پر تمام اداکارائیں، گلوکارائیں اور کئی طرح کی کارائیں اور ماڈل گرلز، رقاصائیں شامل ہوں گی۔

اس قسم کے بھان متی کے کنبے کو جو دین واخلاق اور سیاسی اصول پسندی کے مقابلے میں مرفوع القلم ہو، اسے اگر حکومت صاحبہ سیاست جیسی شریفانہ ذمہ داری کے دائرے میں لا گھسیڑیں گی تو کس قدر تخریبی نتائج پیدا ہوں گے۔

ساتواں اندیشہ یا وسوسہ یہ ہے کہ اخبارات میں یہ بات کئی بار آچکی ہے کہ سندھ کارڈ تو استعمال ہو چکا۔ اب وزیراعظم کسی وقت شیعہ کارڈ استعمال کریں گی۔ آپ چاہیں یا نہ چاہیں، آپ کے مظاہراتی ہجوموں میں شیعہ بھرپور طریق سے آئیں گے، فساد انگیز نعرے لگائیں، اور کارڈ استعمال ہو جائے گا۔ جب یہ حالات کا گہرا مطالعہ رکھنے والوں کو معلوم ہے کہ ایک طرف گلگت چترال سے لے کر (جہاں شیعہ آبادی بھی ہے اور اسمٰعیلی اڈا بھی بن گیا ہے) سری نگر تک نئی شیعہ سلطنت کی طرح ڈالنے پر لوگ سوچ

رہے ہیں، کیونکہ آثار سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ دوسری طرف یہ بات مشہور ہے اور شائع ہو چکی ہے کہ سندھ سے شروع کر کے گریٹر بلوچستان حتیٰ ایران تک شیعہ تسلط قائم ہو سکتا ہے۔ جب کہ سندھ اور بلوچستان (خصوصاً کوئٹہ میں) جارحانہ طرز عمل والے شیعہ موجود ہیں۔ ادھر آپ نے بہت سے محکموں اور بنکوں میں شیعہ افسر بہت مقرر کئے ہیں۔ اور عام ملازم بھی بھرتی کئے ہیں، لیکن ایوان میں نہیں بتایا کہ آبادی کے تناسب سے معاملہ کیا ہے؟ ہمارے اندر نہ فرقہ پرستی ہے، نہ شیعہ بھائیوں کو ہم غیر سمجھتے ہیں، مگر حقائق کو واضح رہنا چاہیے۔

اندریں صورت شہر بہ شہر تو علمائے اہل سنّت کی مجالس قوم اس کے لیے اپنے لوگوں کو لب بند رکھنے اور صبر کرنے پر مجبور کریں گے، جب کہ دوسری طرف سے پہلے کی طرح جارحیت ہوگی، اور خصوصیت سے آپ کے طلب کردہ جلوسوں میں سجاتے کیا کیا ہوگا۔

ہم نہیں کہتے کہ یہ باتیں ضرور صد فی صد درست ہیں یا ایسا ہونا چاہیے۔ ہم تو صرف آپ کو توجہ دلا رہے ہیں کہ اس خطرے سے قوم کو بچائیے۔ سارا کچھ متزلزل ہو جائے گا۔

خدا را سوچو کہ اس پاکستان کے لیے بڑوں اور چھوٹوں، ننھے منّے لالوں کی جانوں اور ماؤں بہنوں کی عصمتوں کی کتنی قربانیاں دی گئی ہیں۔ اور اب اپنے ملک میں عین دورِ جمہوریت میں قوم سے یہ ظالمانہ خراج کس بے دردی سے لیا جا رہا ہے۔ اب جو مسلمان محکمہ مذہبی امور سکے تعاون سے مسلمانوں کے خلاف لادینیت کی جنگ لڑیں گے، وہ آخرت کی عدالت میں خدا کو کیا جواب دیں گے کہ بے نظیر کو خوش کرنے کے لیے ہم نے شریعت بل کے خلاف جنگ کی۔ اور اسی رَو میں ہم نے موجودہ لادینی نظام دینی نظام پر ترجیح دے کر قائم رکھا ـــــ ظالمو! نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن شفاعت تھامنے کا موقع کیسے پاؤ گے۔

خدا کے لیے خیال کرو کہ تم سب ایک عذاب کے گھیرے میں ہو اور روز دردناک واقعات ہو رہے ہیں۔ اور یہ واقعات زیادہ بڑے طوفان کا اشارہ کر رہے ہیں۔ خدا سے توبہ و استغفار کر کے اور نیکی کا کوئی کام کر کے اس طوفان سے بچنے کی دعا

کہو۔ اگر تم نے شریعت بل کی مخالفت کی تو کوئی بلا ٹوٹ پڑے گی۔

ساری قوم آئندہ چند دنوں میں دیکھ لے گی کہ اُن کے اندر لادینیت پسند، انحراف پسند، مریضانِ تجدید، اعتقادی افتراقیت کے مسحور، منافق اور وقت کے جبابرہ وقت کے فدائی غلام، نسوانی حکومت کے سینڈل چاٹنے والے، مال وجاہ اور ذرا ذرا سی خواہش کے بُتوں کے پُجاری، ہم میں کون کون سے ہیں اور کس کس طبقے سے برآمد ہوتے ہیں اور کس مرتبے کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ان کو قوم دیکھے اور پہچان لے کہ یہی اس کی مصیبتوں کا باعث ہیں۔

حرف آخر یہ کہ ہماری نسوانی حکومت کو شریعت بل کی مخالفت کا جھومر مبارک ہو۔

نیا شگوفہ

نہایت درجہ افسوسناک امر یہ ہے کہ ہماری وزیر اعظم صاحبہ خدا کے مقابلے پر اُتر آئی ہیں اور اس کے نازل کردہ حکمِ قرآن کو ماننے سے انکار کرکے ایک نصِ صریح کے خلاف اعلانِ جنگ کر چکی ہیں۔

جنگ مورخہ ۲۰ جولائی میں فرماتی ہیں کہ ہم لوگوں کے ہاتھ کاٹنا مناسب نہیں سمجھتے۔

قرآن کے یہ الفاظ صریح اور ناقابلِ تحریف و تاویل ہیں کہ وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوٓا أَيْدِيَهُمَا (سورۃ المائدہ ۳۸)

محاربہ کی سزا قرآن میں یوں بیان ہوئی ہے:

أَن يُقَتَّلُوٓا أَوْ يُصَلَّبُوٓا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم مِّنْ خِلَافٍ أَوْ يُنفَوْا مِنَ الْأَرْضِ (المائدہ ۳۳)

قرآن کے نصوصِ صریح اور احکامِ واضح کی مخالفت کرنا اقتدار اور دولت کو تو شاید نقصان نہ پہنچائے مگر ایمان کے لیے تباہ کن ہے۔

حکمتِ سیّد مودودیؒ

عذاب کا ایک حکم واپس لے لیا گیا!

اِس وقت عذاب کے سے حالات درپیش ہیں۔ دُنیا کی اقوام بالعموم اپنے گناہوں کی رَو میں آگے ہی چلتی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ تباہی آجاتی ہے۔ قرآن میں ہے کہ صرف ایک قومِ یونسؑ کی مثال ایسی ہے کہ جس پر عذابِ معلّق کے ٹوٹ پڑنے کا وقت قریب آگیا، مگر پوری قوم نے توبہ کرلی اور اللہ نے عذاب کا حکم واپس لے لیا۔

کاش کہ ہمارے ہاں کے علماء قوم کو ظلم و خیانت کے جرائم پر متنبہ اور توبہ پر متوجہ کرتے اور لوگ قومِ یونسؑ کی طرح ایک دن تمام شہروں اور قصبوں اور دیہات میں توبہ کے لیے جمع ہوتے اور خدا کے سامنے زاری کرتے۔ یقیناً خدا قوم کو بچا نکالتا۔ ورنہ اور کوئی علاج نہیں ہے۔ (مدیر)

یونس علیہ السلام جن کا بائیبل میں نام یوناہ ہے اور جن کا زمانہ ۸۶۰ – ۷۸۴، قبل مسیحؑ کے درمیان بتایا جاتا ہے۔ اگرچہ اسرائیلی نبی تھے مگر ان کو اشور (اسیریا) والوں کی ہدایت کے لیے عراق بھیجا گیا تھا۔ اور اس بنا پر اشوریوں کو یہاں قوم یونس کہا گیا ہے۔ اس قوم کا مرکز اس زمانہ میں نینوا کا مشہور شہر تھا، جس کے وسیع کھنڈرات آج تک دریائے دجلہ کے مشرقی کنارے پر موجودہ شہر موصل کے عین مقابل پائے جاتے ہیں۔ اور اسی علاقے میں یونسؑ نبی کے نام سے ایک مقام بھی موجود ہے۔ اس قوم کے عروج کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس کا دارالسلطنت نینوی ۶۰ میل کے دور

میں پھیلا ہوا تھا۔

اغلب یہ ہے کہ یہ وہی بستی ہے جس کو (عذاب کی زد میں آتے دیکھ کر۔ اضافہ از مدیر) چھوڑ کر حضرت یونسؑ بھاگ گئے تھے[1]

اُن کے جانے کے بعد عذاب آتا دیکھ کر جو ایمان اُس بستی کے لوگ لے آئے تھے اُس کی حیثیت صرف توبہ کی تھی جسے قبول کر کے عذاب اُن پر سے ٹال دیا گیا۔ اب حضرت یونسؑ دوبارہ ان کی طرف بھیجے گئے تاکہ وہ نبی پر ایمان لا کر باقاعدہ مسلمان ہو جائیں۔

(مولانا مودودیؒ، بحوالۂ علامہ آلوسی مزید یہ لکھتے ہیں):۔

حضرت یونسؑ نے اُن کو (یعنی اشوریوں کو۔۔ مدیر) خبر دی کہ تیسرے دن اُن پر عذاب آجائے گا اور تیسرا دن آنے سے پہلے آدھی رات کو وہ بستی سے نکل گئے[2] پھر دن کے وقت جب عذاب اس قوم کے سروں پر پہنچ گیا .... اور انہیں یقین ہو گیا کہ سب ہلاک ہو جائیں گے تو انہوں نے اپنے نبی کو تلاش کیا، مگر نہ پایا۔ آخر کار وہ سب اپنے بال بچوں اور جانوروں کو لے کر صحرا میں نکل آئے اور ایمان و توبہ کا اظہار کیا .... پس اللہ نے اُن پر رحم کیا اور اُن کی دُعا قبول کر لی۔ حوالہ: روح المعانی جلد ۱۱ ص ۱۷۰ [3]

ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن۔ ج ۲۔ نوٹ ۹۸۔ ص ۳۱۲ (سورۂ یونسؑ)
" " ج ۴۔ نوٹ ۸۴۔۸۵۔ ص ۳۰۹ (سورۂ الصّٰفّٰت)

---

[1] "بھاگ گئے" کے لفظ سے بظاہر اُلجھن سی پیدا ہوتی ہے، مگر ظاہر ہے کہ مصیبت سے، عذاب سے، سانپ سے، درندے سے بھاگا ہی جاتا ہے اور قرآن نے چونکہ اَبَقَ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کے یہی معنی لغت میں ہیں۔

[2] یہ قصہ الگ ہے کہ حضرت یونسؑ کو کن حالات سے گزرنا پڑا۔

(باقی حاشیہ بر صفحہ ۳۰)

انڈونیشیا

جہاں مغربی جمہوریت کا مطلب ہے اقلیتی حکومت

پوپ جان پال دوم کے دورے کے دو ماہ بعد تک بھی انڈونیشی منتظر رہے کہ پوپ کی طرف سے اُن کی اس شکایت کا کوئی جواب ملے جو انہیں مغرب کے حمایت یافتہ انڈونیشی کلیساؤں کی سرگرمیوں پر تھی کہ وہ بقول اُن کے غربا اور محتاجوں کو اپنے "گلے" میں داخل کرنے کے لیے غربا پرنے، رشوت دینے اور دھونس جمانے جیسے "غیر مسیحی" ہتھکنڈوں پہ اُتر آئے تھے۔

پوپ کا دورۂ انڈونیشیا (۹ تا ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۹ء) بہت مصروفیت اور تگ و دو کا تھا۔ انہوں نے ایک خطبہ جکارتا کے بیسنایان اسپورٹس اسٹیڈیم میں دیا۔ پھر شہر جوگجاکارتا سے کوئی دس کلومیٹر دور آدی شُت جپٹو کے ہوائی اڈے پر، پھر ایک اور خطبہ تُن تُن گاں میں، جو شمالی سماٹرا کے دارالحکومت میدان سے کوئی ۲۵ کلومیٹر پرے ایک دُور افتادہ گاؤں ہے۔ پوپ صاحب نوسا تنگرا تیمور میں واقع فلورس کیتھولک مرکز بھی گئے۔ اگلے ہی دن وہ مشرقی تیمور گئے جہاں اُنھوں نے چار گھنٹے گزارے۔ ہر شام وہ واپس آکر جکارتا میں ویٹیکن سفارت خانے میں شب بسری کرتے نہ کہ سرکاری مہمان خانے میں۔ اس کے علاوہ صرف فلورس ایسا مقام تھا جہاں وہ رات کو بھی ٹھہرے۔ مشرقی تیمور میں ان کے دورے کا یہ مطلب لیا گیا کہ گویا ویٹیکن حکومت نے اس صوبے پر انڈونیشیا کی حاکمیت

بزبانِ خاموشی تسلیم کر لی۔

پوپ کے دورے کو غیر معمولی اظہار (کوریج) انڈونیشی ٹیلی ویژن (T V R I) اور ریڈیو (R R I) کے علاوہ مقامی ریڈیو اسٹیشنوں نے بھی دیا۔ کہ جکارتا والا خطبہ قومی نشریاتی رابطے پر اور دوسرے خطبے مقامی طور پر دکھائے اور سنائے گئے، اور چھ دن تک اخباروں کی شہ سرخیاں پوپ کی سرگرمیوں سے بھری ہوتی تھیں۔

صدر سوہارتو سے پوپ کی تین ملاقاتیں ہوئیں۔ مسلمان، پروٹسٹنٹ، کیتھولک، ہندو اور بدھ رہنماؤں نے بھی انہیں خوش آمدید کہا۔ ہر بولنے والے کو خیر مقدمی کلمات کہنے کے لیے پانچ پانچ منٹ دیئے گئے۔ مسلمانوں کی نمائندگی نیم سرکاری مجلسِ علماء نے کی، اور اس کے ترجمان نے انڈونیشیا میں مذہبی یک جہتی پیدا کرنے کی ضرورت کا حوالہ دیا۔ اور شائستگی سے تجویز پیش کی کہ اس معاملے میں پوپ کو اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔ اپنے خیر مقدمی خطاب میں وزیر امور مذہبی منور شاذلی نے بھی اس کی طرف خفیف سا اشارہ کیا۔ وہ خود بھی اس انڈونیشی "مقدس جنگ" کا شکار ہیں۔ (ان کی بیٹی ایک عیسائی سے بیاہی ہوئی ہے۔) مسٹر شاذلی نے کہا کہ (انڈونیشیا میں) مذہبی مسائل چونکہ بہت نازک ہیں اس لیے ضروری ہے کہ ہر مذہبی گروہ یک جہتی برقرار رکھے اور ہر خود غلط ہونے سے باز رہے۔

بہرکیف پوپ صاحب نے جو پیغام ان کو بالواسطہ اور شائستگی کے ساتھ پہنچانے کا اہتمام کیا گیا تھا اُسے یا تو وصول نہیں کیا یا بالکل نظر انداز کر دیا۔ جواب میں انہوں نے پنکا سلا (پنج شلا؟) کو دُعا دی (یعنی انڈونیشیا کے کثیر المذہبی ضابطے کے تسلط کو جس نے ۹ر۸۶ فیصدی مُسلم اکثریت کو قربان کر کے ۶ر۹ فیصدی پروٹسٹنٹ اور کیتھولک اقلیتوں کو غیر جمہوری طور پر اختیارات دے رکھے ہیں)۔ نیز انڈونیشیا میں اعلیٰ اسطح کی مذہبی یک جہتی اور روا داری کی تعریف فرمائی۔ اور کیتھولک لوگوں کو یہ تک تلقین کر گزرے کہ یسوع مسیح کی تعلیمات کے موافق کمزوروں اور غریبوں کے سماجی استحکام بڑھائیں۔

بہر حال، یہ کہنا تو مشکل ہے کہ پوپ کو اپنے میزبان ملک کی غالب اکثریت کی بشدت محسوس ہونے والی تشویش کی خبر ہی نہ تھی۔ انہیں انڈونیشیا کے مسلم رہنماؤں کی طرف سے کم از کم دو پیغام تو وصول ہو ہی گئے۔ ایک تو ملک کی سب سے بڑی اسلامی تعلیمی و معاشرتی بہبود کی تنظیم کے صدر اے آر فخر الدین کا، اور دوسرا انڈونیشیا کے سب سے محترم اسلامی رہنما اور سابق وزیر اعظم ڈاکٹر محمد ناصر کا۔ ڈاکٹر ناصر کے خط پر امور مذہبی کے دو سابق وزیروں، کے ایچ مصیقر اور پروفیسر ڈاکٹر ایچ ایم راشدی اور ایک سابق وزیر مملکت کے ایچ رُسلی عبدالواحد کے بھی دستخط تھے۔

مسٹر فخر الدین کے نامہ "خیر مقدم و خدا حافظ بجناب پوپ جان پال دوم" میں تنظیم میں انڈونیشیا میں پوپ کے آدمیوں کے طریقوں پر مایوسی اور یہ امید ظاہر کی کہ خود پوپ کو عیسائی بنانے کے یہ طور پسند نہ ہوں گے جن سے عوام کے احتیاجوں اور دکھوں کا استحصال ہوتا ہے۔

ادھر ڈاکٹر ناصر اور ان کے ہم دستخطیوں نے بھی "جناب تقدس مآب" کو خوش آمدید کہا اور توقع ظاہر کی کہ یہ "پاپائی دورۂ انڈونیشیا میں کیتھولک عیسائیوں اور مسلمانوں کے مابین بہتر تعلقات پر منتج ہوگا" البتہ سرِدست انہوں نے تشویش ظاہر کی کہ انڈونیشیا میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے تعلقات میں برہمی سے فروغ اور ترقی کو خطرہ پیدا ہو گیا ہے جس کا باعث ہے "ڈائیکونیا" (خدمت) کی لعنت اور انڈونیشیا میں عیسائیوں کا مسلمانوں سے ناقابل برداشت رویہ۔ اِس سلسلے میں انہوں نے "ڈائیکونیا" کی لعنت پر جون ۱۹۷۶ء کے "اعلانِ چیمبیسی" کا حوالہ بھی دیا۔ مسلم اور عیسائی رہنماؤں نے اس مشترکہ اعلان میں "عیسائی کلیساؤں اور مذہبی تنظیموں پر زور دیا تھا کہ" دنیائے اسلام میں اپنی ناروا ڈائیکونیا سرگرمیاں روک دیں"۔

ڈاکٹر ناصر اور ان کے ہم دستخطیوں نے رومن کیتھولک کلیسا کے سربراہ کو یہ بھی یاد دلایا کہ خود ویٹیکن نے مسلمانوں سے گہری الفت جتائی تھی۔ کیونکہ "وہ

اعلیٰ اخلاقی زندگی کے شائق ہوتے ہیں۔ اور اللہ کی عبادت، خصوصاً نماز، زکوٰۃ اور روزے کے ذریعے بجالاتے ہیں" اور یہ کہ ویٹیکن کی "مقدس مجلس" (SACRED SYNOD) نے بھی زور دیا تھا کہ ماضی کو بھول کر عیسائیوں اور مسلمانوں کے مابین مفاہمت کی مخلصانہ کوشش کی جائے" (ویٹیکن کا اعلان II)

مسلمان رہنماؤں کا کہنا تھا کہ "بہرکیف، اس ہدایت اور حبیبی کی قرارداد دونوں کا عیسائیوں کی انڈونیشیا میں مرتدسازانہ سرگرمیوں پر کوئی اثر نہیں ہوا" اور ان سرگرمیوں سے "دونوں مذہبی فرقوں عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی بڑھتی جا رہی ہے"۔ اور اس خیال سے کہ شاید جناب پوپ ذاتی طور پر اس میزبان ملک میں اپنے آدمیوں کے خفیہ اور غیرمسیحانہ ہتھکنڈوں سے باخبر نہ ہوں، اس خط کے ساتھ پانچ ہزار الفاظ پر مشتمل ایک رپورٹ بھی نتھی کر دی گئی، جس میں "مسیحیت" میں بھرتی کرنے کے طریقے بطور نمونہ درج تھے۔

انڈونیشی مجمع الجزائر میں اسلام ساتویں صدی میں مسلم تاجروں کی سادہ اور مثالی زندگی سے متعارف ہوا اور بغیر فوجوں یا سیاسی چھتری کی پشت پناہی کے، اپنے ہی نور سے پھیلتا چلا گیا۔ مگر سیاسی بالادستی نہ ہونے کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ جب ہزاروں جزیروں پر پھیلے ہوئے لاکھوں لوگ مسلمانوں کے واسطے سے اسلام قبول کر رہے تھے تو انہیں اسلامی طرزِحیات سکھانے اور ایک اسلامی معاشرہ بنانے کے باقاعدہ انتظامات بھی برائے نام ہی ہوئے اور جب تک سماجی اور سیاسی تنظیمیں بنیں اور کھڑی ہوں، یہ مجمع الجزائر یورپی استعمار کی آماجگاہ بن گیا۔

ہسپانیہ نے ۱۵۱۶ء میں ملوکا اور "سولور جزائر" دریافت کیے۔ ان کے پیچھے پیچھے پرتگالی آدھمکے۔ جب فرانسسکس زیویر لیس اس امید کے ساتھ تہ ناتے میں اترا کہ ان "غیرمہذب" جزائر کو اپنی رعایا اور عیسائی بنائے۔ ولندیزیوں نے ۱۶۰۵ء میں اپنی

بالادستی قائم کر لی، اور ۱۷۹۹ء تک "جزائر شرقِ الہند" پر ان کا قبضہ مکمل ہو گیا جب (برطانوی) ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس خطّے پر اپنی بالادستی سے دست بردار ہو جانے کا فیصلہ کر لیا۔

نو آبادیاتی استعمار کے خلاف مسلم مدافعت دو صدیوں پر پھیلی رہی۔ مگر جب تک مسلمان بالآخر زیر ہوئے، نوّے فیصد کے لگ بھگ انڈونیشیا مسلمان ہو چکا تھا۔ استعماری قبضے کا ایک نازک مگر فطری نتیجہ یہ نکلا کہ مُسلم معاشرہ مدافعت ہی پر مجبور رہا۔ اور اس کی اسلامی نشو و نما بڑی حد تک رُک گئی۔ ۱۹۴۸ء میں سیاسی آزادی کا یہ مطلب نہ نکلا کہ انڈونیشیا کی ابتدائی اسلامی نشو و نما بھی دوبارہ جاری ہو گئی۔ صدیوں کی نو آبادیاتی لُوٹ کھسوٹ اور بڑی مہارت سے تیار کردہ سماجی اور سیاسی کاریگری نے یہ یقینی بنا دیا ہے کہ اپنی مُسلم آبادی کی بھاری اکثریت کی "جمہوریت" کے باوجود انڈونیشیا اپنا اسلامی سفر دوبارہ جاری نہیں کر سکتا۔

اقتدار کی منتقلی جب ناگزیر ہو گئی تو نو آبادیاتی آقاؤں نے یہ اطمینان کر لیا کہ انڈونیشیا کی نمائندہ مُسلم قیادت کے بجائے مشکوک اسلامی اوصاف والے حوصلہ مند جاوا والوں کے ہاتھ میں اختیارات جائیں۔ سیاسی نظام کی اسلامی بنیادیں روکنے کے لیے ایک بے معنی سا کثیر المذہبی نظریاتی ضابطہ پنیکا سلا (پنج شیلا)[1] کے نام سے وضع

[1] یہ بظاہر ایسے اُصول ہیں کہ جن کا مقصد مذہبی تصادموں کو روکنا ہے، مگر درحقیقت یہ دستوری طور پر ایک سیکولر نظام کا فارمولا ہیں، جن کے ہوتے ہوئے مسلمان اکثریت بھی یہ آواز نہیں اُٹھا سکتی کہ یہاں کوئی اسلامی اُصول و قوانین ہونے چاہئیں یا مُسلم اکثریت کے مُلک پر غیر مسلموں کی برتری نہیں ہونی چاہیے۔ حکومت ایسی ہر آواز اور تحریک اور تنظیم کی مخالف ہے اور اُسے جبراً کُچل دیتی ہے جو "پنج شیلا" سے ہٹ کر ہو۔ یعنی یہ "پنج بنائے لادینیت" ہیں جن کا انڈونیشیا میں دَور دَورہ ہے اور مسلمان بے بس و بے کس ہو کر رہ گئے ہیں۔ اسلام تو پھر آگے کی بات ہے (مدیر)

کر لیا گیا ۔ تقریباً ۳ سال تک سوکارنو کو موقع دیا گیا کہ فوجی کا سا کردار ادا کرے اور اس نئے نئے امیر بننے والے ملک کا سارا معاشی ڈھانچہ تباہ کر دے ۔ مسلمانوں کو ولندیزی حاکموں کی جسمانی رخصتی سے آزادی تو کم ملی ، البتہ دباؤ اس سے بھی زیادہ برداشت کرنا پڑا جس سے انہیں نوآبادیاتی حکمرانی کے دور میں سابقہ پیش آیا تھا ۔

اِس منظر میں جب سوکارنو تباہی مچا چکا اور اپنا کام پورا کر چکا تو نیا ڈرامہ کھیلا جانے لگا ۔

سوکارنو حکومت کا تختہ اُلٹنے کے لیے انڈونیشی کمیونسٹ پارٹی (P.K.I) سے کام لیا گیا ۔ اور تقریباً اُسی وقت مبیّنہ طور پر کچھ ہلڑباز دجو فی الحقیقت آج تک گمنام کارگزار ہیں) آگے آگئے ۔ اور انڈونیشیا کے پانچ چوٹی کے مسلمان جرنیلوں کو قتل کر دیا کہ معمول کی رُو سے سوکارنو کا تختہ اُلٹنے پر وہی اقتدار سنبھال لیتے ۔ نام نہاد کمیونسٹ پارٹی کی اقتدار پر قبضے کی کوشش ناکام رہوئی جیسا کہ مقصود ہی تھا کہ ناکام ہو پھر کمیونسٹوں اور کمیونسٹ کہلانے والوں کا بے تحاشا ، پُراسرار اور بڑے پیمانے پر قتلِ عام ہوا جس سے انڈونیشی معاشرے کو گھرا گھاؤ لگ گیا ۔ تب یہ "محسن" اور "نجات دہندہ" مگر غیر معروف سے بریگیڈیر جنرل سہارتو صاحب اُبھر کر آئے ۔ بس جبھی سے جنرل اور بعد کو صدر سہارتو صاحب انڈونیشا کے سیاسی منظر پر تقریباً ربع صدی سے بے دغدغہ حاوی چلے آ رہے ہیں ۔ اور ان کا مشن کیا ہے ؟ انڈونیشیا پر ایک "نیا نظام" مسلط کرنا ۔

اس "نئے نظام" میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے تھوڑی ہی گنجائش ہے ۔ چاہے مسلمان یہی کہہ کہہ کر اپنا دل خوش کرتے رہیں کہ ان کا ملک دُنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک ہے ، مگر فی الحقیقت انڈونیشیا جدید نوآبادیاتی استعمار کا کامیاب ترین نمونہ بن گیا ہے ۔ ایسا نمونہ جس کی تقلید مسلم دُنیا میں جا بجا کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں ، خصوصاً نائجیریا اور سوڈان میں ۔ بنگلہ دیش فی الحال ابتدائی "سوکارنوی" مرحلے میں ہے ۔ اور اس "نئے نظام" کے بیچ — چند ملکوں کے نام بطورِ مثال لیے جائیں تو —

ملیشیا، مصر اور پاکستان میں بھی بوٹے جا چکے ہیں۔

سوشلزم کے نام پر انڈونیشی معیشت کی سوکارنو کے ہاتھوں تباہی نے مغربی طرز کی "بحالی" کے لیے بہت بڑا بہانہ مہیا کر دیا۔ تباہی کی ضد فروغ ٹھہرا، اور فروغ، معاشی پالیسی سے لے کر سیاست اور دین تک ہر چیز متعین کرنے کا اعلیٰ ترین معیار بنا، بلکہ انڈونیشیا کا دینِ اعلیٰ ہی فروغ قرار پایا۔ اور "فروغ دہندگان" لازماً سابقہ نوآبادکار اور مشنریوں والے ممالک سے آئے۔ سیکڑوں ہزاروں کمیونسٹوں اور کمیونسٹ کہلانے والوں کے اندھا دھند اور قطعاً بلاجواز قتلِ عام نے ملک کو ہلا کر رکھ دیا تھا، اور لوگوں کے اس خونی سانحہ سے سنبھلنے اور اس کے اصل مقاصد پر غور کرنے سے کہیں پہلے "زخم دوز" حضرات منظر پر جا پہنچے۔

سہارتو کا دور مشنریوں اور کثیر الاقوامیت کے قائلوں کے لیے گویا عید کا زمانہ بن گیا ہے۔ اور اگر انڈونیشیا والے ان میں سے ایک کے چنگل سے کسی نہ کسی طرح نکل بھی آئیں تب بھی یہ مشکل ہے کہ وہ دوسرے کے پھندے سے خود کو آزاد کرا لینے کے قابل ہو سکیں گے۔ لگتی تو یہ اعداد و شمار کی بازی گری ہی ہے ۔۔۔ اگرچہ یہ بجائے خود بھی یہ سنگین بات تھی ۔۔۔ مگر مردم شماری کے اعداد مسلمان آبادی میں کمی اور خود کو پروٹسٹنٹ اور کیتھولک لکھوانے والوں کی تعداد میں اضافہ ظاہر کر رہے ہیں۔ ۱۹۶۵ء میں ۹۵ فیصدی سے ۱۹۷۱ء میں یکایک ۲/۱ ۷ فیصدی گھٹ کر ۲/۱ ۸۷ فیصد رہ جانے کی زقند کے سوا یہ تبدیلیاں اتنی زیادہ نمایاں نہیں ہو رہیں کہ عام لوگوں کو چونکا دیں، تاہم ایک مخصوص رجحان کی مقبولیت ثابت کر دینا ہی ان کی اصل معنی خیزی ہے۔ اگر ۱۹۶۵ء کا سا ایک ہنگامہ اور برپا ہو جائے تو مسلم آبادی کے اعداد میں زبردست کمی اور ساتھ ہی پروٹسٹنٹ اور کیتھولک آبادی میں اختیارات میں اتنا ہی اضافہ ظاہر ہونے لگے گا۔ اور جب تک انڈونیشیا میں غیر مسلم آبادی اکثریت کے لگ بھگ نشان تک نہ جا پہنچے، اس میں عددی جمہوریت آنے کی امید نہیں ہے۔

بے شک ایک سرکاری ضابطہ کارروائی بھی ہے تاکہ اس سے تمام مشنری

اور تبدیلیٔ مذہب کی سرگرمیوں کی نگرانی کی جائے۔ ۱۹۶۹ء میں داخلی اور مذہبی اُمور کی وزارتوں نے مل کر طے کیا کہ بڑھتی ہوئی تبدیلیٔ مذہب سے موجودہ پیروانِ مذہب کے درمیان مناقشت برپا نہ ہونے پائے۔ چنانچہ ہر طرح کی تحریص، جبر یا دھونس ممنوع قرار پائے اور ہدایت کی گئی کہ مذہب کی اشاعت سے نہ کوئی قانون شکنی ہو، نہ عوام کے امن و امان میں خلل پڑے۔ یہ بھی قانوناً طے کیا گیا کہ کسی نئی عبادت گاہ کی تعمیر کی اجازت محکمہ اُمورِ مذہبی کے مقامی نمائندے کی سفارش پر اور منصوبہ کے قواعد کے مطابق — البتہ مقامی صورتِ حال پر اس کے مضمرات کو مدِنظر رکھتے ہوئے دی جائے گی۔

دس سال بعد ان رہنما خطوط کو مزید واضح اور قوی بنایا گیا۔ ۱۹۷۹ء میں دونوں متعلقہ وزارتوں نے مزید واضح کیا کہ مذہبی رشد میں پیسہ، دوائیں، کپڑے اور دیگر سامان دینا یا رسالے، کتابیں اور کتابچے تقسیم کرنا بھی شامل سمجھا جائے گا اور اہم تر یہ کہ مذہبی گروہوں کو ایسے شخص کا مذہب تبدیل کروانے کی کوشش بھی ممنوع قرار دی گئی جو پہلے ہی اپنے مذہب کا پیرو ہو۔

مگر ان قواعد کی پابندی کم اور خلاف ورزی زیادہ ہوتی ہے۔ مسلمان آبادیوں کے بیچوں بیچ بڑے بڑے گرجے بن رہے ہیں۔ پورے علاقے میں سے ان گرجوں میں حاضری دینے والے چاہے تھوڑے ہی ہوں مگر اس عمارت سے کلیسا کی طاقت کا مظاہرہ ضرور ہوتا ہے۔

کلیسا کی طاقت کو انڈونیشیا میں ٹوکا نہیں جا سکتا۔ اور گزشتہ سالوں میں یہ اور بھی نمایاں ہو گئی ہے۔ صدر سوہارتو کی حکومت میں آٹھ کلیدی وزارتوں پر پروٹسٹنٹ اور کیتھولک کلیساؤں کے بارسوخ ارکان فائز ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں:

۱۔ جنرل (ریٹائرڈ) ال بی مردانی (کیتھولک) وزیر قومی دفاع

۲۔ ایڈمرل (ریٹائرڈ) سوتدمود (پروٹسٹنٹ) وزیر رابطہ برائے سیکیورٹی و سیاسی اُمور۔

(باقی بر صفحہ ۴۵)

اسلامی نظامِ معاشرت کا ایک بہت اہم پہلو

حکیم شریف احسن صاحب

معاشرت مِل جُل کر رہنے کا نام ہے۔ انسان اپنی فطرت سے مجبور ہیں کہ مِل جُل کر رہیں۔ اِس لیے بغیر کسی جبر کے وہ مل کر رہتے ہیں۔ رہبانیت سے انسانوں نے بحیثیت مجموعی ہمیشہ گریز کیا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ کسی قوم یا ملک کے سب کے سب افراد بستیوں کو چھوڑ کر ویرانوں کا رُخ کرلیں۔ اور ہر انسان پہاڑ کے کسی غار یا جنگل کی کسی کھوہ میں اپنی ایک الگ دُنیا بسالے، جس کی کل آبادی فردِ واحد پر مشتمل ہو۔

اگر یہ صحیح ہے، اور تاریخ کی گواہی یہی ہے کہ یہ صحیح ہے تو اس سے بنیادی سوال یہ سامنے آتا ہے کہ انسان مِل جُل کر کس طرح رہیں؟ کیا معاشرے میں جنگل کا قانون رائج ہو کہ جس کے جی میں جو آئے کر گزرے یا کچھ اُصول و قواعد ہوں جو انہیں ساتھ ساتھ رہنے کا سلیقہ سکھائیں؟ اس سوال کے جواب کے مطابق ہی دُنیا میں مختلف معاشرے وجود میں آئے ہیں اور حقیقتاً کسی بھی نظامِ زندگی کی اصل آزمائش اس کے معاشرتی نظام میں ہوتی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ انسانوں کا انسانوں سے رویّہ ہی وہ چیز ہے جو کسی نظام کے مقام و مرتبہ کا تعین کرتا ہے۔

اِسی رویّہ کا ایک اہم پہلو وہ ہے جس کا تعلق پڑوس سے ہے۔ بہت اہم اس لیے کہ دُنیا میں ایسا انسان کہیں دستیاب نہیں کہ جس پر پڑوسی کی مہر نہ لگی ہو۔ فی الحقیقت پوری انسانی سوسائٹی پڑوسیوں پر مشتمل ہے۔ یہ ایک ایسی زنجیر ہے جس کی

ہر کڑی دوسری کڑی سے پیوست ہے۔ دنیا کا ہر شخص ہمسایہ ہے اور ایسا ہونا اس کی فطرت کے عین مطابق ہے۔ کوئی ہمسایہ نہ ہو، محض ایک شاعرانہ آرزو ہے، جس شاعر نے یہ تمنا کی تھی اُس کی ہنگامہ پسندی کا یہ عالم تھا کہ نغمۂ شادی کے میسّر نہ ہونے پر وہ نوحۂ غم کی آرزو کیا کرتا۔

انسانی سوسائٹی بوقلمون سوسائٹی ہے۔ یہاں قدم قدم پر اور پہلو بہ پہلو دکھ اور سکھ، بیماری اور صحت، افلاس اور امارت، بہار اور خزاں اور اسی طرح کے دیگر تضادات موجود ہیں۔ انسانی ہمدردی کا تقاضا ہے کہ ان تضادات کو کم کیا جائے۔ اس سلسلہ میں پڑوس ایسا وسیع اور ہمہ گیر اور مؤثر کردار ادا کرسکتا ہے۔ اسلام کے پیش نظر چونکہ ایک اعلیٰ اور پاکیزہ انسانی معاشرہ کی تشکیل ہے اس لیے اس نے اس کی اہمیت کو پوری طرح محسوس کیا ہے اور اسے وہ مقام دیا ہے جس سے اور معاشروں کا تخیل بھی ناآشنا ہے۔ پڑوسیوں کا مرتبہ تو اور آگے ہے۔ ایک صحیح حدیث کے مطابق اسلامی معاشرہ میں عام مسلمانوں کی باہمی رحمت، محبت اور تعلقِ خاطر کی کیفیت بھی جسم کے مانند ہوتی ہے، جس کا ایک عضو اگر بیمار پڑتا ہے تو پورے کا پورا جسم بے خوابی اور بخار میں مبتلا ہو کر بے قرار ہو جاتا ہے[1] یا اہل ایمان کے باہمی تعلق کی مثال عمارت کی سی ہے جس کی ہر اینٹ دوسری اینٹ کے لیے قوت کا باعث ہوتی ہے۔ یہ مثال بھی صحیح حدیث میں بیان ہوئی ہے[2] اور اسلام کے تصورِ ہمسائیگی پر پوری طرح منطبق ہوتی ہے۔ اسلامی معاشرے میں گھروں یا بہ الفاظ دیگر پڑوسیوں کا مقام عمارت میں لگی ہوئی اینٹوں کا سا ہے جن کی باہم پیوستگی اور ایک دوسرے کا بوجھ اُٹھانے میں عمارت کی قوت اور بقا کا راز مضمر ہے۔ اسلام میں پڑوس کا یہی کردار ہے۔ پڑوسی الگ الگ گھروں میں رہتے ہیں۔ ان گھروں کے مابین دیواریں بھی ہوتی ہیں، لیکن انہیں محض اس لیے کھڑا

---

[1] بخاری، الصحیح، بابی الحلبی، مصر، ۱۳۵۲ھ جلد ۴ ص ۳۶

[2] ایضاً ص ۳۷

کیا جاتا ہے کہ کوئی اس کے آرام میں مخل نہ ہو۔ یہ دیواریں پڑوسیوں کے باہمی خلوص و محبت کے جذبات میں حائل نہیں ہوتیں، بلکہ ان کو اور مضبوط کرتی ہیں۔ اور "خمیہ ہائے ما جدا دلہا یکیست" کی تصویر پیش کرتی ہیں۔ اس تمہید کے بعد اب اسلامی نظامِ معاشرت کے رُخ ہمسائیگی کا ایک مختصر سا خاکہ ملاحظہ ہو۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ۔[1]

"اور تم اللہ ہی کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیراؤ، اور والدین، قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، رشتہ دار ہمسایوں، غیر رشتہ دار ہمسایہ، ہم نشین، مسافر اور اپنے لونڈی، غلاموں کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرو، اللہ تعالیٰ اترانے والوں، بڑائی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

یہ آیت اسلامی معاشرے کی ایک ہمہ گیر اساس مہیا کرتی ہے۔ اس میں تین چیزیں خاص طور پر قابلِ غور ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کو یہ انسان — جن میں پڑوسی بھی شامل ہیں — اس قدر عزیز ہیں کہ ان کے ساتھ احسان کا حکم اپنی عبادت کے امر اور شرک سے نہی کے بالکل متصلاً دیا ہے۔ دوسرا یہ کہ حکم عدل کا نہیں احسان کا ہے۔ اور جیسا کہ امام راغب اصفہانی کہتے ہیں — "الاحسان فوق العدل"[2] یعنی احسان عدل سے برتر چیز ہے۔ عدل یہ ہے کہ انسان دوسروں کو ان کا حق دے دے اور اپنا حق اُن سے وصول کر لے، لیکن احسان کسی کو اس کے حق سے زیادہ دینے اور اپنے حق سے کم لینے پر رضامند ہونے کا نام ہے۔ انسان کا ایک مسئلہ ہمیشہ سے یہ رہا ہے

---

[1] القرآن ۴/۳۶

[2] امام راغب اصفہانی المفردات فی غریب القرآن، بابی الحلبی مصر ۱۳۸۱، ص ۱۱۹۔

کہ وہ اپنے حق پر قناعت نہیں کرتا، دوسروں کے منہ سے نوالہ چھیننے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر سوسائٹی میں عدل کی فضا موجود ہو تو اس پریشان کُن مسئلہ کے سر اُٹھانے کے مواقع بہت کم رہ جاتے ہیں، لیکن یہاں یہ نہیں کہا جا رہا۔ "عدل کرو اور زیادتی نہ کرو" بلکہ ایثار اور قربانی کی تعلیم دی جا رہی ہے کہ "دو تو زیادہ دو اور لو تو کم لو"۔ عدل میں بعض اوقات جبر کا ایک پہلو موجود ہوتا ہے۔ انسان نہیں چاہتا، مگر اُسے عدل کے تقاضے پورے کرنے پڑتے ہیں، لیکن احسان ہمیشہ خوش دلی سے ہوتا ہے۔ اِسی بنا پر اس سے وہ معاشرہ وجود میں آتا ہے جس کے افراد خلوص و ایثار کے پیکر ہوتے ہیں خود بھوکے رہ کر دوسروں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ اور دوسروں کی جان بچانے کے لیے اپنی جان قربان کر دیتے ہیں۔ جس طرح دیکھنے والوں کو پیپل کے ننھے سے بیج میں پیپل کا پورا قدآور درخت نظر آ جاتا ہے۔ اِسی طرح احسان کے اس ایک لفظ میں اسلامی معاشرے کا سارا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔

آیت مذکورہ میں خاص طور پر قابلِ غور تیسری چیز وہ سزا ہے جو احسان سے رُوگردانی کرنے والوں کے لیے تجویز کی گئی ہے۔ قرآن نے انہیں مختالاً فخوراً یعنی بالفاظ شاہ ولی اللہ دہلوی "متکبر خودستائندہ" اور بہ ترجمہ مولانا محمود الحسنؒ "اترانے والا بڑائی کرنے والا"، کہہ کر اللہ کی ناپسندیدگی کی سزا سُنائی ہے، جس سے سنگین تر سزا کا تصور بھی ممکن نہیں۔ ایک انسان کی اس سے زیادہ کیا بدبختی ہو سکتی ہے کہ وہ اس ذاتِ رحمٰن و رحیم کی نگاہ میں ناپسندیدہ اور مبغوض قرار پائے جس کی رحمت ہر چیز کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ قرآن کی یہ آیت محکمات میں سے ہے اور ہمسایوں کے حقوق کے بارے میں نصِ قطعی، لیکن اس میں ان معنوں کی تفصیل بیان نہیں کی گئی۔ بس ایک لفظ احسان کہہ کر وہ سب کچھ بیان کر دیا گیا ہے جو حسنِ سلوک کے ذیل میں آتا ہے۔ ان کی توضیح و تبیین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہے لیکن اسے پیش کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عربی لغت کی رُو سے لفظ جار (پڑوسی) کی کچھ تشریح کر دی جائے:

الجار من یقرب مسکنہ منک ...... و استعظم حق

عقلاً و شرعاً عبر عن کل من یعظم حقہ او یستعظم حق

غیرہ بالجار...... و یقال استجرتہ فاجارنی۔[1]

"جار وہ ہے جس کا مسکن تمہارے قریب ہو...... چونکہ جار (پڑوسی) کا حق عقلاً و شرعاً بڑا سمجھا گیا ہے۔ اس وجہ سے ہر وہ شخص جس کا حق بڑا ہے، اُسے جار کہا جاتا ہے...... اور کہتے ہیں استجرتہ میں نے اس سے پناہ مانگی فاجارنی تو اُس نے مجھے پناہ دی۔

الجار المجاور فی المسکن، الشریک فی العقار، المجیر

و المستجیر۔ الجوار ایضاً العہد والامان۔ والجوار

ان نعطی الرجل ذمۃ فیکون بہا جارک۔ تقول العرب

ہو فی جواری ای فی عہدی وامانی۔[2]

الجار کے معنی ہیں سکونت میں قریب، جائیداد میں حصہ دار، پناہ دینے والا، پناہ مانگنے والا۔ جوار: پڑوس کے علاوہ اس کے معنی عہد اور امان کے ہیں۔ جوار یہ ہے کہ کسی شخص کو تم حفاظت دو۔ وہ تمہارے جوار (حفاظت) میں ہوگا عرب کہتے ہیں، وہ میرے جوار یعنی میری حفاظت اور امان میں ہے۔

جار اور جوار کا یہ مفہوم ان کے اُردو اور فارسی مترادفات ــــ پڑوسی، پڑوس، ہمسایہ، ہمسائیگی ــــ سے کہیں زیادہ وسیع اور گہرا ہے۔ قرآن و حدیث کا مطالعہ کرتے وقت اُن کی یہ معنویت ضرور ذہن میں رہنی چاہیے۔ اسلامی نقطہ نظر سے اس کی خاص اہمیت ہے۔ اس کے بغیر حسنِ جوار (اچھی ہمسائیگی) کی اس وسعت اور گہرائی تک نظر نہیں پہنچے گی جو اسلام کو مطلوب ہے۔ اس کی رُو سے خود جوار (آس پاس

---

[1] امام راغب اصفہانی المفردات فی غریب القرآن بابی الحلبی مصر ۱۳۸۱ھ ص ۱۱۹۔

[2] سعید الخوری الشرتونی اقرب الموارد، قم ایران ۱۴۰۳ھ جلد ۱ ص ۱۴۹

رہنے میں) کا یہ تقاضا موجود ہے کہ پڑوسی مشکل وقت میں ایک دوسرے کے کام آئیں۔ اور جب اچانک انہیں کسی سہارے یا پناہ کی ضرورت ہو تو اس کی تلاش میں کہیں دور نہ جانا پڑے۔ گھر کے سامنے یا پس دیوار اسے موجود پائیں۔

اب قرآن مجید کے حکمِ احسان کی تبیین و تفسیر رسولِ کریم کے ارشادات میں ملاحظہ ہو۔ حضورؐ نے فرمایا:

ا۔ خدا کی قسم وہ شخص صاحبِ ایمان نہیں، خدا کی قسم وہ شخص صاحبِ ایمان نہیں، خدا کی قسم وہ شخص صاحبِ ایمان نہیں۔ صحابہؓ نے عرض کیا۔ "یا رسول اللہؐ کون ؟" فرمایا: "جس کے پڑوسی اس کی ایذا رسانیوں سے محفوظ نہ ہوں[1]۔"

۲۔ جو شخص اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے پڑوسیوں کی عزت کرنی چاہیے[2]۔

۳۔ تم میں سے کوئی شخص صاحبِ ایمان نہیں ہوتا جب تک کہ اپنے پڑوسی یا فرمایا بھائی کے لیے بھی وہی چیز پسند نہ کرے جسے وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے[3]۔

حضورؐ کے ان فرمودات سے واضح ہے کہ آپؐ کی نگاہ میں ایمان اور حسنِ جوار (اچھی ہمسائیگی) کا آپس میں کتنا گہرا رشتہ ہے کہ اگر دوسرا نہ ہو تو پہلے کی نفی ہو جائے گی۔ ایک مومن کے لیے ایمان سے زیادہ قیمتی چیز کوئی نہیں۔ وہ اس کی خاطر جان قربان کر دیتا ہے۔ اس سے بڑھ کر برا فعل کیا ہو سکتا ہے کہ جس کا ارتکاب کر کے وہ اپنی سب سے زیادہ قیمتی چیز گنوا بیٹھے!

اوپر احادیث میں حسنِ جوار کے مختلف درجات بیان ہوئے ہیں۔ اس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اگر کوئی صاحبِ ایمان اپنے پڑوسی کو آرام نہیں پہنچا سکتا تو کم از کم وہ اسے ایذا تو نہ دے۔ اس بات کو حضورؐ نے ایسے مؤثر پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ

[1] بخاری، الصحیح ۳۷/۴
[2] ایضاً، مسلم، الصحیح　　کراچی۔ ت۔ ن ۱/۱۵۸/۵۰
[3] مسلم، الصحیح ۵۰/۱

اس کی نظیر بہت کم ملتی ہے۔ ایک حضورؐ کا ارشاد پھر تین مرتبہ اور ہر مرتبہ خدا کی قسم کے ساتھ۔ اس سے پڑوسیوں کو ایذا رسانی کے فعل کی شناخت کا اندازہ کرلینا چاہیے!
دوسری حدیث میں حسنِ جوار کے مثبت اور برتر درجہ کی نشان دہی کی گئی ہے اور وہ یہ کہ ایمان کا تقاضا صرف یہ نہیں کہ ہمسایہ کو ایذا نہ دی جائے، بلکہ یہ بھی لازم ہے کہ باہم عزت و احترام کا رویہ اپنایا جائے۔ تیسری حدیث ہمیں عزت و احترام کے مقام سے بھی آگے "من تو شدم تو من شدی" کے مقام پر لے جاتی ہے اور ہر صاحبِ ایمان سے مطالبہ کرتی ہے کہ اگر اُسے اپنا ایمان عزیز ہے تو وہ اپنے پڑوسی کے دکھ کو اپنا دکھ اور اس کے سُکھ کو اپنا سُکھ سمجھے اور غیریت کی ہر دیوار کو گرا دے۔
ایمان سے آگے محبت کا مقام ہے۔ اِسی سے ایمان کے اندر حرارت پیدا ہوتی ہے۔ قربِ الٰہی کے اس بلند ترین مقام تک پہنچنے کے لیے بھی حضورؐ نے حُسنِ جوار کو لازم قرار دیا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو فرمایا تو صحابہ کرامؓ آپؐ کے وضو کے پانی کو (تبرکاً چہروں پر) ملنے لگ گئے۔ حضورؐ نے پوچھا "تمہیں کس چیز نے اس پر آمادہ کیا؟" انہوں نے عرض کیا "اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت نے" فرمایا: "جس کو یہ پسند ہو کہ وہ اللہ اور اُس کے رسولؐ سے محبت کرے یا اللہ اور اس کا رسولؐ اُس سے محبت کریں اُسے چاہیے کہ جب بولے سچ بولے، اُس کے پاس امانت رکھی جائے تو (عند المطالبہ) اُسے واپس کر دے۔ اور اپنے ہمسایوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے"[1]۔
یہ حدیث محبتِ الٰہی کو حسنِ جوار سے منسلک کر کے اس کی اہمیت کا ایک نیا رُخ سامنے لاتی ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ صحابہؓ کا حضورؐ کے آبِ وضو سے حصولِ تبرک کے فعل کا محرک خدا اور رسولؐ کی محبت تھی۔ اسی لیے حضورؐ نے انہیں اس سے روکا نہیں، بلکہ محبت کی ایک بلند تر سطح سے آشنا کیا اور واضح کیا کہ اس محبت کا راز خدا کے بندوں کی محبت اور ان کے حقوق کی ادائیگی میں مضمر ہے جس کا ایک اہم مظہر پڑوسیوں سے فیاضانہ برتاؤ ہے۔
(باقی)

---

[1] محمد بن عبداللہ الخطیب، مشکوٰۃ المصابیح مجتبائی دہلی۔ جلد ص ۴۲۴۔ بحوالہ بیہقی شعب الایمان۔

ایک تفسیری اشکال اور اس کا حل

جناب پروفیسر سیّد محمد سلیم صاحب

ابوظہبی سے ایک صاحب نے خط لکھا ہے۔ ان کو سورہ النجم کی آیات (۵ تا ۲۷) کی تفسیر میں اشکال محسوس ہوتا ہے۔ وہ اس کا حل چاہتے ہیں۔

مفسرین نے ان آیات کی تین طریقوں سے تفسیر بیان کی ہے۔

ا۔ بعض مفسرین نے ان آیات کو واقعہ معراج سے متعلق قرار دیا ہے۔ اور ملاقات کو اللہ تعالیٰ سے ملاقات قرار دیا ہے۔ مگر اس تفسیر کے ماننے میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ سورہ النجم نبوت کے پانچویں سال میں نازل ہوئی ہے۔ اور معراج شریف کا واقعہ نبوّت کے بارھویں سال میں پیش آیا ہے۔ اس لیے معراج کا ذکر سات سال پہلے نازل ہونے والی سورۃ میں کیسے ہوسکتا ہے۔ اس لیے یہ تفسیر صحیح نہیں ہے۔

۲۔ بعض دوسرے مفسرین نے اس ملاقات کو حضرت جبریل علیہ السّلام کی ملاقات قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت جبریل کو اپنی اصلی شکل میں دیکھا جس کا بیان مذکورہ بالا آیات میں ہے۔ مگر یہاں ایک آیت ہے۔ فَاَوْحٰىٓ اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى۔ حضرت جبریل رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کو عبد کس طرح کہہ سکتے ہیں؟ اس مشکل سے بچنے کے لیے بعض لوگوں نے اس آیت کو اللہ تعالیٰ کا قول تصور کیا ہے۔ مگر سیاقِ کلام میں اللہ کا لفظ کہیں نہیں آیا ہے۔ اس تفسیر میں یہ اُلجھن ہے۔

۳- ان آیات کی ایک تیسری تفسیر بھی ہے۔ میں ان دنوں "دین ودانش" تصنیف مولانا محمود علی پروفیسر کیوررمنتلہ کالج (۱۹۱۰ء) دیکھ رہا تھا۔ وہاں ص ۱۱۹ پر حاشیہ میں ان آیات کی جو تفسیر لکھی ہے وہ یہ ہے:

"آیت کا ترجمہ ضحاک کی روایت کے مطابق کیا گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو تفسیر خازن) اور جو وحی والہام کے راز اس آیت میں بیان کیے گئے ہیں، اگرچہ سمجھنے والوں نے مختلف طرزوں پر سمجھا ہے، مگر جیسا کہ تفسیر عرائس البیان اور تفسیر ابن عربی سے مستفاد ہوتا ہے ـــــ اس مقام پر نبیؐ کے دونوں مراتب کا مذکور ہے۔ یعنی ایک درجہ وہ ہے جب کہ نبی فرشتہ کی وساطت سے نورِ معرفت اخذ کرتا ہے۔ اور یہ حالت اکثر رہتی ہے ـــــــــــ اور دوسرا درجہ وہ ہے جبکہ وہ بعض منتخب اوقات میں فرشتہ سے زیادہ لطیف اور پاکیزہ ہوجاتا ہے اور اس وقت جہاں تک وہ ترقی کرسکتا ہے، فرشتہ وہاں تک پہنچنے سے قاصر ہوتا ہے مگر چونکہ ایسی اعلیٰ لطافت انسانی قالب میں رہ کر ہمیشہ نہیں رہ سکتی۔ اس لیے جب نبی اس حالت سے واپس آتا ہے تو پھر لطائف کے اس درجہ سے اُتر کر جو فرشتہ کا انتہائی مقام ہے، فرشتہ کی وساطت سے وحی کا سلسلہ جاری ہوجاتا ہے۔

چنانچہ اس آیت میں بھی یہی بیان کیا گیا ہے کہ رسول نے فرشتہ کی وساطت سے علوم ربانی حاصل کیے۔ جس کے بعد اعلیٰ کنارہ پر پہنچ کر فرشتہ کی وساطت ختم ہوگئی اور وہ وہیں ٹھہر گیا۔ رسول خدا سے قریب ہوتا گیا۔ اس کی طرف جھکتا گیا۔ حتیٰ کہ جس طرح دو کمانوں کو ملانے سے دائرہ بن جاتا ہے۔ اور دائرہ میں قوسی خطوط کی ابتدا اور انتہا میں بظاہر تمیز نہیں رہتی۔ اس طرح رسول کو بھی اس وقت خدا سے وہ کامل وصال تھا، بلکہ اس تشبیہ سے بھی زیادہ۔ اور اس وقت وہ راز منکشف ہوئے جو

ہوئے اور دل نے جو لطف اُٹھانا تھا وہ اُٹھایا۔ مگر پھر اس حالت کے بعد مقامِ سدرۃ المنتہیٰ یعنی فرشتہ کے انتہائی درجۂ ترقی پر، اس کو دوبارہ موجود پایا۔"
یہ تفسیر سب سے اچھی نظر آتی ہے۔

(بقیہ حاشیہ حکمتِ مودودیؒ صفحہ ۱۲)

۳؎ بائیبل کی واقعہ بیانی پر بھی ایک نظر:-

تب (یعنی عذاب آنے کا احساس ہونے پر) نینوہ کے باشندوں نے خدا پر ایمان لا کر روزہ کی منادی کی اور ادنیٰ و اعلیٰ سب نے ٹاٹ اوڑھا۔ اور یہ خبر نینوہ کے بادشاہ کو پہنچی، اور وہ اپنے تخت پر سے اُٹھا اور بادشاہی لباس کو اُتار ڈالا اور ٹاٹ اوڑھ کر راکھ پر بیٹھ گیا۔ اور بادشاہ اور اس کے ارکانِ دولت کے فرمان سے نینوہ میں یہ اعلان کیا گیا اور اس بات کی منادی ہوئی کہ کوئی انسان یا حیوان گلّہ (غلّہ) یا رمہ (سامانِ نوش) کچھ نہ چکھے اور نہ کھائے پئے، لیکن انسان اور حیوان ٹاٹ سے ملبّس ہوں اور خدا کے حضور گریہ و زاری کریں، بلکہ ہر شخص اپنی بُری روش اور اپنے ہاتھ کے ظلم سے باز آئے۔ شاید خدا رحم کرے اور اپنا ارادہ بدلے اور ہم ہلاک نہ ہوں۔ تو وہ (یعنی خدا) اس عذاب سے جو اُس نے ان پر نازل کرنے کو کہا تھا، باز آیا، اور اسے نازل نہ کیا۔ (یوناہ - ص ۸۶۶ تا ۸۶۸ - اُردو ایڈیشن - ۱۹۴۹ء)

برما کے روہنگیا مسلمانوں کا ابتلا[1]

اراکان برما کے روہنگیا مسلمان آج کل جنرل سامانگ کی مطلق العنان ریاست کی انتظامیہ یعنی "کونسل برائے بحالیٔ قانون و نظم و ریاست" (سلارک) کے تحت انتہائی دردناک اور ابتلاء کے دن گزار رہے ہیں۔ پہلی حکومتوں کی طرح موجودہ حکومت بھی روہنگیا مسلمانوں کو مسلسل ظلم کا نشانہ بناتے ہوئے انہیں ان کے آبائی وطن سے نیست و نابود کر رہی ہے۔ اس حکومت نے ریاست اراکان کے دارالحکومت (AKYAB) کے سب سے بڑے گاؤں (چکی پارا) کو مسمار کر کے تیس ہزار سے زائد روہنگیا مسلمانوں کو بے سہارا اور شدید مشکلات سے دوچار کر دیا ہے۔

نسل پرستوں نے اپنے پیشرؤں کے طے شدہ منصوبے کے تحت یہ اقدام ۲۷ دسمبر ۱۹۸۹ء کو اٹھایا تاکہ مسلمانوں کی اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کر کے مسلم اکثریت کے علاقوں میں (BUDDHIST) اور غیر مسلموں کو آباد کیا جا سکے۔ نسل پرست

---

[1] ترجمان القرآن کی عام اشاعتوں کا زمانۂ تعطل (بہ ضرورت اشاعتِ خاص اجتماع نمبر) طول پکڑ گیا۔ یہ دردناک اور اہم مراسلہ بڑی تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔ ہمارے ستم رسیدہ بھائیوں کے زخم ہائے خون چکاں نہ جانے اب کتنے پھیل چکے ہوں گے۔ اللہ رحم کرے۔ اہلِ استطاعت مدد کریں، جن سے یہ نہ ہو سکے وہ ہر نماز کے ساتھ دعا کریں۔ (ادارہ)

دشمنوں نے گیارہ مسجدیں، ایک بڑا مدرسہ اور بہت سے مکتبوں کو مکمل طور پہ تباہ کر دیا۔

اراکان (AKYAB) کی جامع مسجد کو مکمل طور پہ مسمار کر دیا گیا۔ سلارک — (SLORC) کے حکام نے پہلے مقامی مسلمانوں کو مسجد مسمار کرنے کا حکم دیا۔ اُن کے انکار پر (SLORC) نے (AKYAB) کی جیل سے مسلمانوں قیدیوں کو لا کر مسجد مسمار کرنے کا حکم دیا۔ ان قیدیوں کے انکار پہ انہیں بھی بُری طرح پیٹا گیا۔ آخر کار (AKYAB) جیل کے (MAGH BUDDHIST) قیدیوں کے ذریعے مسجد کو شہید کرا یا گیا۔

(SLORC) نے پہلے ہی منصوبہ بنا رکھا ہے کہ (AKYAB) کے مزید تین گاؤں لکھارا پارا، بہاسارا اور پاڈار لکھ چک کو بھی مسمار کر دیا جائے۔

ہم ڈاکٹر محمد یونس (صدر)، مولانا سیف الاسلام (نائب صدر) اور سعید الرحمٰن (سیکرٹری جنرل) جنرل سامانگ کے قوانین کو سختی سے نظر انداز کرتے ہیں، اور اقوامِ متحدہ اسلامی کانفرنس، رابطہ عالمِ اسلامی اور دیگر بین الاقوامی اداروں کے علاوہ دُنیا کے پُرامن لوگوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ آگے بڑھ کر برما کے مسلمانو کو ظلم سے نجات دلائیں۔

اِنسدادِ مُنکرات بِالْیَدْ

نعیم صدیقی

بار بار یہ بحث چھڑی کہ انسدادِ منکرات کی مہم کیسی رہی۔ مختلف اصحاب نے واقعات بھی بیان کیے، پریشانی کا اظہار بھی کیا، مگر ان ساری باتوں کو الگ رکھ کر میں اصولی طور پر حدیثِ پاک کے اس حصے پر مختصر گفتگو کرنا چاہتا ہوں کہ:

مَنْ رَأٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ ۔۔۔۔۔ الخ

یعنی حدیث شریف میں منکر کو ہاتھ سے مٹانا، پھر زبان سے مٹانا، پھر قلب میں اس کو برا سمجھنا، یہ سب مدارج بیان ہوتے ہیں اور کوئی شخص جو مومن ہو اس کے لیے لازم ہے کہ منکر یا برائی یا غلط امور کے متعلق ان تین میں سے کسی نہ کسی درجے پر ہو اور بالاتر درجے کو حاصل کرنے کی کوشش کرے، کیونکہ اصل نتیجہ خیز اور عملاً مؤثر قوت "ید" ہی کی ہے۔

میں ایک کوتاہ علم آدمی ہوں۔ قرآن اور حدیث کے احکامِ خاص اور معرکہ آرا مباحث کے بارے میں نہ صرف درس و مطالعہ کے ایک دورِ طویل سے گزر کر میں نے بتوفیقِ الٰہی اصل مغز و مقصد یا تاویلِ صحیح کو سمجھ لیا ہے بلکہ محض تحدیثِ نعمت کے طور پر ہزار تشکر و تذلل کے جذبے سے یہ بات بھی عمر کے آخری حصے میں کہنا چاہتا ہوں کہ مسائل جب سامنے آتے ہیں تو ذہن سے چند اشارات اس طرح ابھرتے ہیں جیسے کسی بورڈ پر سرخ و سبز و نیلی بتیاں جلتی ہیں، اور ان کی مدد سے میں تھوڑے سے مطالعہ اور تھوڑے سے تفکر سے کوئی اہم راز پالیتا ہوں۔ اللہ کا شکر ہے کہ خدا کی ذرا سی اشاراتی رہنمائی سے (جو شاید کچھ نہ کچھ ہر مومن کو حاصل ہوتی ہے)

بشرطیکہ وہ توجہ کرے اور دل کی فریکوئنسی کو ملاء اعلیٰ کی فریکوئنسی سے ہم آہنگ رکھے۔ میرے بعض حل کردہ مسائل قدرے تفرد[1] کا رنگ رکھنے کے باوجود نصوصِ دین اور حکمتِ دین کی کسوٹی پر غلط نہیں نکلے۔ مگر اللہ معاف کرے کہ یہ تحدیثِ نعمت کے عاجزانہ موقف سے آگے بڑھ کر کوئی تعلّی یا کوئی دعویٰ ہو۔ مَیں گناہوں کی ایک دَلدَل سے گزر کر مشکل سے ایک ایک قدم اُٹھا کر پھولی ہوئی سانس کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہوں۔ بس اُدھر سے مجھ پر اتنا کرم ضرور ہے کہ میرے سامنے کچھ دُوری پر سخت تاریک رات میں ایک سبز مشعل جھلملا رہی ہے۔ اور دوسری نوازشِ خاص یہ ہے کہ دِل نہ دَلدَل کے خوف سے یاس اندوز ہے، نہ تاریکی کے ڈر سے حُزن کا شکار! آدمی اپنے آپ کو خدا کے سپرد کردے تو کس کا خوف اور کیسا غم!

متذکرہ حدیث اور اس کے تحریر کردہ جزواوّل پر عالمانہ گفتگو کرنے کے لیے ضروری تھا کہ قرآن کی تفاسیر اور شروحِ احادیث کی مدد سے نکتہ بہ نکتہ بحث و استدلال کیا جاتا۔ مگر یہ کام علماء کا ہے کہ وہ مدرسوں یا مناظروں یا فتووں یا تصانیف میں خواص کے لیے ایسی بحثیں کریں۔ مَیں تو ایک عام آدمی ہوں اور عوام کی ضرورتوں کو ملحوظ رکھ کر سادہ طریق سے مسئلے کی پوری تصویر ان کو دکھا دینا چاہتا ہوں، جیسے کوئی سرجن دِل کا آپریشن کرتے ہوئے سینہ کھول کر حضرتِ دل اور ان کے متعلقات کو اُٹھا کر ایک طشت میں الگ رکھتا ہے اور خلقِ خدا ٹیلی ویژن پر یہ منظر دیکھ رہی ہوتی ہے کہ سینے سے باہر رکھا ہوا دِل دھڑک رہا ہے۔ میرے سامنے اصل معاملہ ڈیمانسٹریشن کا ہے جو عوام اور نوجوانوں کو بہت سی حقیقتیں خود ہی سمجھا دیتا ہے۔

---

[1] یہ رنگِ تفرد اتنا ہلکا ہوتا ہے کہ میری تحریروں میں یہ کسی صاحبِ نظر کو نہیں کھٹکا۔ تفرد سے مراد یہ کہ سوچنے اور حل تک پہنچنے کے لیے میں اپنا ایک طریقہ استعمال کرتا ہوں۔ مجھے علم کا ایک ذرہ بھی جب کبھی ملا تو میں نے اُسے آفتاب بنا کر اور دسیوں ذرّات ڈھونڈ لیے۔

اصل کام اسلاف کے جمع کردہ علمی اور استدلالی حقائق کو جمع کر کے طالب کی جھولی میں ڈال دینا نہیں، بلکہ اصل کام یہ ہے کہ حلِ مسائل کے لیے لوگوں کو تحقیق و تفکر کے طریق سکھا دیے جائیں۔ یعنی انہیں علم کی راہ کا مسافر بنا دیا جائے، پھر کئی کئی منزلیں راہ میں آکر خیر مقدم کرتی رہیں گی۔

ہم لوگ جب پٹھانکوٹ (دارالاسلام) کے دور میں قرآن و حدیث کا درس لیتے، لٹریچر پڑھتے اور تحریکی اقدامات کے تقاضوں پر غور کرتے تھے تو اس زمانے میں ہم کو دوسری ضروری بنیادی تعلیمات کے ساتھ "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کا دائرۂ کار بھی اچھی طرح سمجھنے کا موقع ملا۔ اور پھر ساری عمر کبھی خلجان نہیں ہوا کبھی کوئی ٹیڑھ ذہن میں نہیں آئی۔ دین کے نقشے میں ہمیں انسدادِ منکرات کا نشان زدہ راستہ معلوم ہو گیا کہ وہ کدھر سے کدھر جاتا ہے اور راستے میں کیا کیا مہالک آدمی کی غلط فکری پیدا کر دیتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آج کل کے تحریکی نوجوان کیوں "فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ" کا مفہوم نہیں جانتے ہیں، یا انہیں کوئی بتانے والا نہیں ہے۔ وہ کیوں ان مبادیات کو جانے بغیر میدان میں کود جاتے ہیں۔ اور پھر ایسی ایسی خرابیٔ احوال کا باعث بنتے ہیں کہ اندیشہ ہوتا ہے کہ تحریک اب تک اپنی جو ساکھ (امیج) بنا چکی ہے، وہ برسوں کی کمائی ملیامیٹ ہو جائے گی۔ ایک آدمی شرافت کا درس دیتے دیتے اگر کسی دن اٹھ کر قتل کر ڈالے تو اس کی آیتِ شرافت ہونے کی حیثیت یک لخت ختم ہو گئی اور اب اس کی ساری زندگی پر اس کا قاتل ہونا چھا گیا۔

کمانڈر کا بھی یہ فرض ہوتا ہے کہ کسی بھی مہم کو اپنی فوج (خصوصاً نوجوانوں) کو بھیجتے ہوئے واضح اور متعین طور پر مہم کا مقصد سمجھائیں، اس کی پالیسی کے خطوط متعین کریں۔ انہیں کرنے اور نہ کرنے کے امور اور طریقوں کے بارے میں تمام ضروری باتیں نوٹ کرائیں۔ سارا کام کارکنوں اور متفقوں و نوجوان طلبہ کے اجتہاد پر نہیں چھوڑ دینا چاہیے۔

"بِيَدِهٖ" کا غلط مطلب سمجھنے والوں نے دعوتِ اصلاح کے اپنے سارے پروگراموں کو بسا اوقات شدتِ جذبات اور محدودیتِ تفقہ کی وجہ سے تباہ کر لیا۔

ایک صاحب اُٹھتے ہیں اور کسی بھی شخص کا تہمد یا پائنچے قینچی سے کاٹ دیتے ہیں جو ٹخنوں کو چھو رہے ہوں۔ (یہ واقعاتی مثال ہے) میں نے بچشمِ خود ایک ایسے سفید ریش بزرگ کو دیکھا، جنہوں نے مسجد میں وعظ کیا اور اتباعِ سنت کی تلقین کی، اور پھر نماز کے بعد جلدی سے نکل کر دروازے پر کھڑے ہو گئے اور جو شخص سامنے آیا اُس کی مونچھیں زیرو کی مشین سے صاف کر دیں۔ پہلے آدمی کو ٹوکا کہ یہ تم نے اتنی بڑی مونچھیں کیوں رکھی ہیں، اُس نے کہا: جی غلطی ہے، ابھی نائی کے پاس جاتا ہوں۔ بزرگ نے کہا کہ نائی کی کیا ضرورت --- یہ کہہ کر انہوں نے زیرو کی مشین شیروانی کی جیب سے نکالی اور مونچھیں صاف۔ پھر یکے بعد دیگرے سب کا صفایا ہو گیا۔
نیک لوگوں کی ایسی پیاری پیاری حماقتوں کی بہت مثالیں دی جاسکتی ہیں، مگر آخر تحریکِ اقامتِ دین کے دائرے میں ایسی پیاری اور نُورانی جذباتیت کا کیا کام۔
میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ بید کے معنی کیا ہیں۔ آپ ہر روز مشاہدہ کرتے ہیں کہ چوراہے پر کھڑا ٹریفک کا سپاہی ہاتھ اُٹھاتا ہے تو ایک طرف کی گاڑیاں رُک جاتی ہیں۔ پھر وہ ہاتھ کو دوسری طرف جنبش دیتا ہے تو کسی اور طرف کی گاڑیاں رُک جاتی ہیں اور رُکی ہوئی چلنے لگتی ہیں۔ آپ ہاتھ ہلاتے رہیں، شور مچاتے رہیں، کچھ نہ ہوگا۔ آپ کے پاس "قوتِ ید" نہیں جو کانسٹیبل کے پاس ہے۔ یہ قوتِ ید اقتدار کے مرکز سے تقسیم ہو کر جگہ جگہ کام کرتی ہے۔ ریلوے گارڈ جھنڈی ہلاتا ہے تو گاڑی چل پڑتی ہے، دوسری ہلاتا ہے تو رُک جاتی ہے۔ آپ دسیوں جھنڈیاں ہلاتے رہیں، کچھ نہ ہوگا۔
جنابِ من! آپ ذرا سا غور کیجیے کہ آیا اسلام کے مکّی دَور کے ۱۳ سال میں یہ امکان نہ تھا کہ حضورؐ اور آپؐ پر ایمان لانے والے صحابہؓ روز دو چار بتوں کو حرم میں جا کر کبھی علانیہ اور کبھی چوری چھپے توڑ دیتے اور دل میں مطمئن ہوتے کہ ہم اپنے ہاتھوں انسدادِ منکرات کر رہے ہیں اور طاغوتی مجسموں کو ختم کر کے شرک پر ضرب لگا رہے ہیں۔ کیا ایک بھی مثال ایسی ہے؟ حرم میں بُت موجود رہے، ان کا بال تک بیکا نہیں ہوا۔ حضورؐ ان بتوں کی موجودگی میں نمازیں ادا کرتے اور رکوع و سجود کرتے۔ اس لیے کہ ابھی

وہ قوتِ "ید" حاصل نہیں تھی جو انسداد منکرات کر سکتی - بلکہ جبراً ایسے اقدامات کرنے سے مکہ کی عمومی تعذیب شدید کے بجائے جان لیوا جنگ چھڑ جاتی اور نہ صرف مٹھی بھر مسلمان ختم ہو جاتے بلکہ سرے سے دعوتِ حق کی جاذبیت باقی نہ رہتی - البتہ بعد کے مدنی دور میں جب قانون اور تلوار کی قوت مسلم جماعت کو مل گئی تو پھر اُنہوں نے خداوندانِ منکرات کو میدانِ جنگ میں بھی اور میدانِ عدالت میں بھی پچھاڑا - فتح مکہ کے موقع پر مجرم انسانوں کو تو معاف کر دیا مگر حرم کے بتوں کا صفایا کر دیا۔

دراصل ابتدائی حالات میں زیادہ تر کام لسانی دعوت و تلقین سے لیا جاتا ہے تاکہ لوگ آہستہ آہستہ برائی کے نظام اور غلط مظاہر و رسوم کے خلاف اجتماعی قوت پیدا کریں - اور اس دور میں کچھ لوگ ایسے حالات میں بھی گھرے ہوئے دل سے برائی سے نفرت کرنے لگتے ہیں - مگر اپنی باطنی کمزوریوں کی وجہ سے، یا مخالفین کی مار دھاڑ سے ڈر کر وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر باللسان کے مقام تک پہنچنے میں دیر کرتے ہیں، مگر دل میں جب باطل کے خلاف نفرت کی چنگاری دہکنے لگتی ہے تو ایک دن آتا ہے کہ اس کی حرارت ان کی زبان سے اور بعد کے کسی مرحلے میں ان کے "ید" سے ظاہر ہو۔

لسانی دعوت پہلے منکرات کے خلاف فضا تیار کرتی ہے - مثلاً آپ محلے کی مسجد کے پاس ایک سنڈاس (فلتھ ڈپو) دیکھتے ہیں - ایک صورت تو یہ ہے کہ جو بھی وہاں گندگی پھینکنے آئے آپ اس سے بھڑ جائیں اور جو اُٹھانے والے ملازمین آئیں اُن سے بھی ٹکرا جائیں - دوسری شکل یہ ہے کہ آپ آہستہ آہستہ مسجد کے لوگوں کو سمجھائیں کہ کسی عبادت گاہ یا خدا کے گھر کے سامنے ایسی خرابی نہیں ہونی چاہیے - پھر محلے کے چوہدریوں سے ملیں، کسی ٹیچر سے، پٹواری سے، حکیم سے، تعلیم یافتہ نوجوانوں سے، نمبردار سے، اور سب کو محبت و نرمی سے سمجھائیں کہ یہ صورت مناسب نہیں - علاوہ ازیں اگر ضرورت ہو تو بلدیہ یا کمیٹی کے دفتر میں جا کر کسی نیک دل افسر سے ملیں اور ان سے بطور افہام و تفہیم بات کریں - اس لسانی جہاد کے نتیجے میں آپ دیکھیں گے کہ دو تین ہفتوں میں ایک قوت جمع ہو گئی ہے - جب معاملہ یہاں تک پہنچ جائے تو دفتر سے بھی آپ

کو منظوری مل جائے گی اور محلہ کی طاقت بھی جمع ہو جائے گی۔ اب گویا پہلے والی صورت کے مماثل حالات پیدا ہو گئے۔ اب کوئی وہاں کوڑا نہیں پھینکے گا، اب اس کا بیاد [illegible] جائے گا۔ اتنی محنت کے بغیر آپ محلہ میں کچھ نہیں کر سکتے تو ملک گیر پیمانے پر کیا کریں گے۔ پہلے ضمیروں کی قوت اپنے ساتھ جمع کیجیے اور دیکھیے کہ اب ۷۰، ۷۵٪ لوگ آپ کے ہم نوا ہو جاتے ہیں۔

ہم نے بچپن میں اپنی دیہی آبادیوں میں دیکھا کہ یکایک ایک آواز اٹھتی کہ اس گاؤں یا اُس گاؤں کے فلاں گھر میں کل ایک بے نکاحی عورت آئی ہے۔ معاشرے کا پہلے سے بنا ہوا دباؤ اتنا سخت تھا کہ ایسی عورت کو کوئی آدمی رکھ نہیں سکتا تھا اور وہ ٹک نہیں سکتی تھی۔ یا کسی شخص نے رمضان میں روزہ شکنی کی اور راز کھل گیا۔ پوری آبادی اس کو دباؤ ڈال کر کس دیتی تھی۔

سو جب تک کم سے کم اتنا دباؤ معاشرے اور اس کی رائے عام کا کسی خاص مظہرِ منکر کے خلاف آپ پیدا نہ کر لیں، آپ دعوت و تلقین کی حد تک آگے نہیں جا سکتے۔ اور اصل منزل تو ریاستی قوت اور قانونی قوت ہاتھ میں آنے کے بعد ملے گی۔

اس بحث میں ایک صورتِ استثنا بھی ہے۔ ہر شخص، ہر مرد و عورت کسی نہ کسی دائرے میں راعی (حاکم) ہے۔ مثلاً ایک شخص اپنے گھر میں افرادِ خانہ کی پہلے اچھی طرح تعلیم و تربیت کر کے ان کو ہم آہنگ کرے، پھر ان کے مشورے سے گھر میں کوئی بھی اصلاح "بالید" کرے تو معاملہ درست رہے گا۔ وہ یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ اب سے حرام رزق اس گھر میں نہیں آئے گا، سو وہ نہیں آئے گا۔ حرام کی کوئی چیز موجود ہے تو وہ اسے اُٹھا کے اصل مالک کے حوالے کر دے گا یا کوئی مالک نہ ہو تو تلف کر دے گا۔ اسی طرح وہ گھر کی تربیت یافتہ رائے عام کے تعاون سے یہ اقدام کر سکتا ہے کہ دیوار پر ٹنگی ہوئی ایک تصویر کو اُتار کر پھینک دے۔ یا سب مل کر یہ فیصلہ کر لیں کہ ریڈیو اور ٹیلی وژن سے سازوں کی آواز نہیں سنی جائے گی۔ یا یہ کہ ٹیلی وژن پر ایسے مناظر نہیں دیکھے جائیں گے جو صریح طور پر ممنوع ہوں۔ یا یہ کہ سرے سے ہم اب ٹیلی وژن

رکھیں گے ہی نہیں - یا فلم نہیں دیکھیں گے - اسی طرح بچوں کے لیے قاعدہ مقرر ہو جاتا ہے کہ آپس میں یا محلہ کے بچوں سے "کالم گلوچ اور ہاتھا پائی نہیں کریں گے -
اسی طرح ایک گوالا اپنی بھیڑوں کے متعلق یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ کب کونسی اور کتنی بھیڑیں بیچ دے یا خرید لے، اُن کے لیے ایک باڑہ ہو یا دو باڑے ہوں - ان میں سے ہر ہفتے جس ایک کو چاہے اپنے لیے ذبح کر لے - وہ ان پر لاٹھی سے اپنا حکم چلا سکتا ہے - کسان اپنے بیلوں کے بارے میں فیصلے کر سکتا ہے، جدھر سے چاہے روکے، جو کام لینا چاہے لے اور جب ضرورت ہو سانٹا استعمال کرے یا کسی کے کھیت میں داخل ہونے سے روک دے - اسی طرح کاروبار کا مالک اپنے کاروبار کے متعلق بڑے بڑے فیصلے کرتا ہے -
مجھے یہ بھی تسلیم ہے کہ موجودہ عالمی دورِ جمہوریت میں (مجھے مغربی جمہوریت کے اس تصور سے سخت کراہت ہے جو اپنی بدترین شکل میں یہاں نافذ ہے) کوئی گروہ یا طبقہ یا جماعت کسی خاص بُرائی کے خلاف شائستہ (داعیانِ حق کے شایانِ شان) مظاہروں سے فضا کو تیار کرنے کا کام کر سکتا ہے -
لیکن اگر کوئی گروہ ایسی تمام چیزوں کو اپنے ہاتھ سے محو کرنے کے لیے بازاروں میں نکل کھڑا ہو جن کے متعلق شہریوں کی اکثریت کا ذہن بنا ہی نہیں، وہ لوگوں کے لیے اذیت اور اپنے لیے شدید مشکلات اور کارِ دعوت میں شدید رکاوٹیں پیدا کرنے کا باعث بنے گا - یعنی کمانے گئے نیکی، اُلٹی آنتیں گلے پڑیں -
دین یا شریعت کا کام کرنا ہو تو پہلے دین یا شریعت کو سمجھیئے، ہر حکم اور ہر پابندی کا مفہوم تفصیل سے سمجھ کر اس کا اطلاق زندگی پر کیجیے - دین کا کام نعرہ بازی، مجمع بازی، شور مچانے، اُچھلنے کودنے، اور لوگوں کے ذہن و ضمیر کی تیاری کے بغیر ان کے املاک اور ان کی ناپسندیدہ متاع پر حملے کرنے کا نام نہیں -
یہ غیر دینی تحریکوں کے طریقے ہیں -

رسائل و مسائل

تفہیم القرآن پر ایک اعتراض کا جواب

سوال: پچھلے دنوں ایک کتاب "مولانا مودودی علماءِ اہل حدیث کی نظر میں" دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اندازِ تحریر نہایت غیر سنجیدہ ہے، مگر اس میں ایک حوالہ قابلِ تحقیق ہے جس کے لیے تکلیف دے رہا ہوں۔

تفہیم القرآن جلد چہارم سورۂ احزاب حاشیہ نمبر ۶۶ میں مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں ...... اسی طرح کا اظہارِ نارضامندی ان کے بھائی حضرت عبداللہ بن جحشؓ رضی اللہ عنہ نے بھی کیا تھا ......

اس پر کتاب مذکور میں اعتراض کیا گیا ہے کہ "حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے نکاح کے موقع پر حضرت عبداللہ بن جحشؓ موجود ہی نہ تھے۔ وہ تو جنگِ احد میں وفات پا چکے تھے۔ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک ہی قبر میں دفن ہوئے تھے"۔ پھر اس کے بعد موصوف نے مولاناؒ کی علمی کم مائیگی کا ذکر زور شور سے کیا ہے اور طنز و تعریض سے کام لیا ہے ابن ہشام ج ۲ ص ۹۸ کا حوالہ دیا ہے۔ براہ کرم اس اشتباہ کو رفع کریں۔

جواب: تفہیم القرآن سورۂ احزاب کے حاشیہ نمبر ۶۶ میں جو بات درج ہے وہ دوسرے مفسرین نے بھی لکھی ہے۔ اور جن صاحب نے اسے ہدفِ اعتراض بنایا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے سوچے سمجھے اور پوری تحقیق کیے بغیر نکتہ چینی

کا شوق پورا کیا ہے۔ تفہیم القرآن کی عبارت کا ضروری حصہ درج ذیل ہے:

"یہ آیت، (الاحزاب ۳۶) اُس وقت نازل ہوئی تھی جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زیدؓ کے لیے حضرت زینبؓ کے سامنے نکاح کا پیغام دیا تھا۔ اور حضرت زینبؓ اور ان کے رشتہ داروں نے اسے نامنظور کر دیا تھا...... اسی طرح کا اظہارِ ناراضامندی ان کے بھائی عبداللہ بن جحش نے بھی کیا تھا...... اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اُسے سنتے ہی حضرت زینبؓ اور اُن کے سب خاندان والوں نے بلا تامل سرِ اطاعت خم کر دیا"......

معترض کا اعتراض یہ ہے کہ "حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے نکاح کے موقع پر حضرت عبداللہ بن جحش موجود ہی نہ تھے، وہ تو جنگ اُحد میں شہادت پا چکے تھے۔

صاحبِ تفہیم کی تحریر کا مدعا فقط یہ ہے کہ حضرت زینبؓ کے حضرت زیدؓ سے نکاح پر اہلِ خاندان رضامند نہ تھے۔ جن میں حضرت عبداللہ بھی شامل تھے۔ لیکن نزول آیت کے بعد حضرت زینبؓ کے بھائی حضرت عبداللہ اور دیگر افرادِ خاندان نے اس نکاح کی تجویز کو بسر وچشم قبول کر لیا۔ یہ تجویز کے عملدر آمد ہونے اور انعقاد نکاح میں ظاہر ہے کچھ مدت درکار ہو گی۔ اور یہ امر ہرگز بعید نہیں بلکہ عین ممکن ہے کہ نکاح کے وقت حضرت عبداللہ زندہ موجود نہ ہوں اور شامل تقریب نہ ہوں۔ تفہیم القرآن میں یہ بات بیان نہیں ہوئی کہ بوقت نکاح حضرت عبداللہ بھی حینِ حیات تھے۔ یہ امر اپنی جگہ صحیح ہے کہ حضرت عبداللہ بن جحش غزوہ احد میں شہید ہوئے۔ غزوہ اُحد شوال ۳ھ میں پیش آیا ہے۔ حضرت زینبؓ کا نکاح حضرت زیدؓ سے ۴ھ میں ہوا ہے۔ نکاح کے معاملات ہمیشہ چند روز یا چند ماہ میں طے اور انجام پذیر نہیں ہو جاتے۔ بعض اوقات اس میں خاصا عرصہ گزر جاتا ہے۔ اس بات کا پورا امکان ہے کہ الاحزاب آیت نمبر ۳۶ کا نزول ۳ھ میں غزوہ احد سے پہلے ہوا ہو جب کہ حضرت عبداللہؓ موجود تھے اور وہ بھی ان افراد خاندان میں شامل ہوں جو پہلے تو اس نکاح پر رضامند

نہ تھے، مگر بعد میں سر بسر سب اللہ اور اس کے رسولؐ کے فیصلے پر راضی ہو گئے ہوں نزول آیت کے بعد نکاح فوری طور پر منعقد نہ ہو سکا ہو اور جب ہوا تو حضرت عبداللہؓ شہادت سے سرفراز ہو چکے ہوں۔

علامہ آلوسی اپنی تفسیر کے اس مقام پر لکھتے ہیں کہ حضرت زیدؓ سے نکاح کا مشورہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تو حضرت زینبؓ نے حضرت زیدؓ کے بارے میں کہا: انا خیر منہ حسباً و وافقہا اخوہا عبداللہ علی ذلک فلما نزلت ...... رضیا و سلما فانکحہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زیداً (میں خاندانی لحاظ سے زید سے بہتر ہوں اور حضرت زینبؓ کے بھائی عبداللہ نے بھی بہن کی رائے سے اتفاق کیا۔ لیکن جب آیت قرآنی نازل ہو گئی تو دونوں اس نکاح پر رضا مند ہو گئے اور سر تسلیم خم کر دیا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نکاح حضرت زیدؓ سے پڑھا دیا۔

امام ابن العربی اپنی کتاب "احکام القرآن" میں سورۂ احزاب کی آیت مذکورہ کی تشریح میں لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب بنت جحشؓ کو حضرت زیدؓ سے نکاح کا پیغام دیا۔ فامتنعت و امتنع اخوہا عبداللہ لنسبہا فی قریش (حضرت زینبؓ اور ان کے بھائی حضرت عبداللہ نے قبیلۂ قریش سے نسبی تعلق کی بنا پر اس تجویز سے اتفاق نہ کیا۔ کیونکہ حضرت زید پہلے غلام تھے)۔ مگر جب یہ آیت نازل ہوئی۔ فقال لہ اخوہا: مُرنی بما شئت فتزوجہا من زید (نزول آیت کے بعد جب حضرت زینبؓ کے بھائی نے آنحضورؐ سے عرض کیا کہ آپ جیسا چاہیں، مجھے حکم فرمائیں۔ پس آپؐ نے ان کا نکاح حضرت زیدؓ سے کر دیا)۔

مولانا سید احمد حسن صاحب محدث اپنی تصنیف "احسن التفاسیر" جلد پنجم میں اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

زینب کی ماں کا نام امیمہؓ بنت عبدالمطلب اور زینبؓ کے بھائی کا نام عبداللہ بن جحش ہے۔ جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں سے درخواست

کی کہ زینبؓ کا نکاح زید بن حارثہ سے کر دیا جاوے تو ان لوگوں نے اس کے منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت نازل فرمائی اور فرمایا کہ امیمہ یا عبداللہ بن جحش یا کسی ایماندار مرد اور عورت کو جائز نہیں کہ اللہ کی مرضی سے موافق اللہ کے رسولؐ کسی کام کا کرنا ٹھہرا دیں تو یہ لوگ اس کام میں خلل ڈالیں۔ کیوں کہ یہ خلل گناہ ہے۔"

نکاح کی تجویز سے حضرت عبداللہؓ کا اختلاف، وہ پھر رضامندی کا اظہار کرنا اور بوقت نکاح حضرت عبداللہؓ کا موجود ہوتا، نہ ہونا یہ دو الگ الگ واقعات ہیں جو مختلف اوقات میں پیش آسکتے ہیں۔ ان کو باہم خلط ملط کرنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟ یہ امر ہرگز خارج از امکان نہیں کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح ہدایت کے بعد حضرت زینبؓ کی اور ان کے عزیزوں کی عدم آمادگی پوری رضامندی میں بدل گئی اور اس تسلیم و رضا میں بھائی بھی شریک تھے، مگر عقد نکاح میں غالباً غزوہ احد اور اس میں حضرت عبداللہ جحشؓ کی شہادت کے باعث تاخیر ہوگئی ہو۔ گو بالآخر خدا و رسول کے فیصلے کی تعمیل کر دی گئی۔

اس طرح کے غیر اہم جزوی اختلافات اور تاریخی اشکالات پر متین علمی انداز میں بحث کرنے کے بجائے ہر بات کو علمی کم مائیگی قرار دینے کی کوشش کرنا بجائے خود علمی کم مائیگی اور قلتِ فہم کا ثبوت فراہم کرنا ہے۔ اقوال سلف میں بے شمار ایسے بیانات ہیں جن میں علمی یا تاریخی تعارض سے سابقہ پیش آتا ہے، لیکن علما بڑے محتاط انداز میں ایسے اختلافات پر اظہارِ رائے کرتے ہیں۔ میں ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ صحیح مسلم کتاب الفضائل میں ایک حدیث حضرت ابوسفیانؓ کی فضیلت میں ہے جو حضرت ابن عباس سے مروی ہے، جس میں وہ روایت کرتے ہیں کہ مسلمان حضرت ابوسفیانؓ کو خاطر میں نہ لاتے تھے تو انھوں نے آنحضورؐ سے عرض کیا کہ میری تین درخواستیں قبول فرمائیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے کہ میری صاحبزادی اُمّ حبیبہؓ نہایت حسین و جمیل ہیں اُسے آپ کی تزویج میں دیتا ہوں...... اب ظاہر ہے اور اس پر اتفاق

ہے کہ حضرت ابوسفیانؓ فتح مکہ کے موقع پر ۸ھ میں اسلام لائے اور حضرت اُمِّ حبیبہؓ اس سے بہت پہلے اسلام لاکر حبشہ میں ہجرت کر گئی تھیں تو حضرت عثمانؓ اور خالد بن سعید کو (جو مسلمان ہو چکے تھے)۔ آنحضورؐ نے وکیل بنا کر حضرت ام حبیبہؓ سے نکاح فرمایا۔ حضرت اُم حبیبہؓ نے تو اپنے والد ابوسفیان کو آنحضورؐ کی فرشی چادر پر بیٹھنے نہیں دیا تھا۔ جب وہ تجدیدِ صلح کی کوشش میں آئے تھے۔ اس حدیث کے اشکالات کو علماء نے محسوس فرمایا اور تسلیم کیا کہ اس روایت میں سند یا متن کے لحاظ سے سہو، وہم یا غرابت موجود ہے۔ لیکن امام مُسلم کے صاحبِ علم و فضل اور حافظ الحدیث ہونے کا انکار وہی کر سکتا ہے جو خود علم و عقل سے عاری و تہی دامن ہو۔ حدیث کے بعد جہاں تک سیرت و مغازی کا تعلق ہے، اس کا دائرہ بہت وسیع و عریض ہے۔ اقوال کا اختلاف ایک حد تک ناگزیر ہے۔ مثلاً اُسد الغابہ میں حضرت زینب بنتِ جحشؓ کے بارے میں ایک قول یہ بھی مروی ہے کہ تزوجها رسول الله صلی الله علیه وسلم ثلاث من الهجرة (ان سے آنحضورؐ نے ۳ھ میں نکاح کیا)۔

مولانا اشرف علی تھانوی "بیان القرآن" میں اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زیدؓ کا نکاح حضرت زینبؓ سے کرنا چاہا، چونکہ حضرت زیدؓ غلام مشہور ہو چکے تھے، حضرت زینبؓ نے اور ان کے بھائی حضرت عبداللہؓ بن جحش نے اس نکاح کی منظوری سے عذر کیا۔ اس پر آیت وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ ...... اُتری۔

شاہ عبدالقادرؒ دہلوی کے ترجمہ پر جو حواشی مولانا محمود الحسنؒ اور مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمہ نے درج فرمائے ہیں، وہاں بھی یہ واقعہ اس طرح تحریر ہے:

"حضرت زینبؓ کی خاندانی حیثیت چونکہ بلند تھی اور زیدؓ بن حارثہ بظاہر داغِ غلامی اُٹھا کر آزاد ہوئے تھے، اس لیے اُن کی نیز اُن کے بھائی کی مرضی زیدؓ سے نکاح کی نہ تھی لیکن اللہ و رسول کو منظور تھا کہ

اس طرح کی موہوم تفریقات و امتیازات نکاح کے رستے میں حائل نہ ہوں، اس لیے آپؐ نے زینبؓ اور ان کے بھائی پر زور دیا کہ وہ اس نکاح کو قبول کر لیں۔ اُسی وقت یہ آیت اُتری اور اُن لوگوں نے اپنی مرضی کو اللہ و رسول کی مرضی پر قربان کر دیا۔"

(غلام علی)

(بقیہ انڈونیشیا صفحہ ۲۰)

۳۔ پروفیسر ڈاکٹر جے بی سُمرلین (کیتھولک) وزیر خزانہ

۴۔ ڈاکٹر راویوس پراویرو (پروٹسٹنٹ) وزیر رابطہ برائے مالیات، معیشت صنعت و نگرانی ترقیات۔

۵۔ کوسماس باتوبارا (کیتھولک) وزیر برائے افرادی قوت۔

۶۔ ڈاکٹر جے جی سوتراجت جیونڈونو (کیتھولک) وزیر کوچک برائے تجارت۔

۷۔ پروفیسر ڈاکٹر ملجانا (پروٹسٹنٹ) وزیر کوچک و وائس چیئرمین نیشنل ڈویلپمنٹ پلاننگ بورڈ۔

۸۔ ڈاکٹر ادریانس موئی (پروٹسٹنٹ)، گورنر، سنٹرل بینک۔

مطبوعات

اسلامی انقلاب کا منہاج | سیّد معروف شاہ شیرازی - ناشر: منشوراتِ اسلامی، چنار کوٹ ضلع مانسہرہ - جدید طباعت، کاغذ ذرا عوامی، ٹائیٹل رنگین، صفحات: ۱۳۶ قیمت: ۲۷/ روپے -

شاہ صاحب مکرم صاحبِ علم و مطالعہ بھی ہیں اور بحرِ تفکّر و تحقیق کے شناور بھی - ان کے ذہن میں مسائل و مباحث ہمیشہ ٹھاٹھیں مارتے محسوس ہوتے ہیں - پیشِ نظر کتاب ان اصحاب کے بحثوں کے جواب میں لکھی گئی ہے، جو تحریکِ اسلامی سے اختلاف رکھ کر ہی اپنا وجود قائم رکھ سکتے ہیں - ان کے انتشار انگیز کام کا ایک اثر یہ ہو سکتا ہے کہ "کثرتِ تعبیر ہا" کی وجہ سے اصل خواب پریشان ہو جاتے - مگر دوسری طرف ان کی تحریر و تکلّم میں اُسی تحریک کی اصطلاحات اور عنوانات اور استعارات اس طرح گھُسے ہوتے ہیں کہ یہ ہر کسی کے لیے نشاناتِ راہ بن جاتے ہیں - صاحبِ منہاج نے انہی حلقوں سے یہ بات سُن لی ہے کہ علمی و سیاسی کام الگ الگ ہونا چاہیے - جب کہ مولانا نے خود علمی کام میں لگ کر سیاسی تحریک کی رفتار کو کمزور کر دیا - یہ انتہائی غلط تصوّر ہے کہ اسلامی جماعت میں ایک شعبہ تو زہد و تقشّف کا الگ ہو، ایک علمی و تحقیقی اور ادبی و صحافتی کام کرنے والوں کا اور تیسرا جھنڈے اُٹھائے نعرے لگاتا ہوا میدانِ سیاست میں بڑھتا جائے - مولانا مودودیؒ نے تو اسلام کو ایک مذہب اور بطور نظام موجودہ دور میں چلنے کے ناقابل کہنے والوں کے چیلنج کا فوری جواب دینا ضروری سمجھا، نیز اپنے ساتھیوں اور بعد والوں کے لیے علمی کام کی بنیادیں رکھ دیں - رہا تقسیمِ کار کا اُصول، سو جماعتوں اور سیاسی تحریکوں (حتیٰ کہ حکومتوں) میں بھی ایسا نہیں ہوتا،

یا مثلاً فوج اور آرٹلری اور فضائیہ اور بحریہ کو لیجیے تو خاصی واضح علیحدگی کے باوجود ان میں گہرا ربط باہم ہوتا ہے، ورنہ جنگ تو لڑی ہی نہ جا سکے۔ فوج کے نقشہ نویس اور جاسوس اور لانگری تک یک جہتی سے کام کرتے ہیں۔ ہمیں کرنا صرف یہ چاہیے کہ ہم کچھ نوجوانوں کو اس سمت میں لگائیں کہ وہ انہماک سے مطالعہ و تحقیق کا کام کریں۔ ایک ٹیم ادب و صحافت کے میدانوں میں جائے، کوئی شعبۂ خدمتِ خلق سنبھالے، لیکن کسی نہ کسی اجتماع اور فورم اور مشاورت کے ذریعے ان میں ہم آہنگی کا سلسلہ مضبوط رہے۔ ورنہ ریسرچ والے کہیں گے کہ کام غلط تصورات پر ہو رہا ہے، سیاست والے اپنا سر اونچا رکھ کر کہیں گے کہ ہمارے کام میں کوئی مداخلت نہ ہونی چاہیے۔ اور ارباب زہد و خشیت پکاریں گے کہ یہ سب کچھ دنیا کے گندے کھیل ہیں۔ ہم اس طرح الگ الگ جتھے نہیں بنا سکتے۔ ایک ہی جماعت کی ایک ہی لیڈرشپ کو مختلف صلاحیتوں کے آدمیوں کو مختلف کاموں میں لگانا ہوگا۔ اور پھر ان کو باہم متعلق اور ہم آہنگ رکھنا ہوگا۔ ورنہ پہلے اختلافات' پھر تصادم اور پھر علیحدگیاں شروع ہو جائیں گی۔

افسوس ہے کہ زیادہ بحث کرنا ممکن نہیں۔ کتاب کو مفید اور دلچسپ اور فکر انگیز پاتا ہوں۔ شیرازی صاحب نے نئے نئے فلسفہ طرازانِ انقلاب کو مضبوط استدلال اور نرم اسلوب سے جواب دیا ہے۔

حسن البناء شہید کی ڈائری | مؤلف جناب حسن البنا شہیدؒ۔ مترجم مولینا خلیل احمد حامدی۔ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۶۔ سفید کاغذ۔ صفحات: ۲۶۶۔ سرورق رنگین، دبیز آرٹ کارڈ۔ قیمت: ۳۸/- روپے۔

میری خوش قسمتی ہے کہ میں نے اس کتاب کو پڑھا، بہت دلچسپی محسوس کی اور بہت استفادہ کیا۔ اس کا پہلا ایڈیشن کئی سال پہلے (۱۳۸۳ھ میں) اسلامی پبلیکیشنز سے شائع ہوا۔ اس وقت ترجمان القرآن میں تبصرہ بھی شائع ہو گیا۔ اب یہ نیا ایڈیشن بھارت سے چھپا ہے۔ اس پر از سر نو تفصیلی ریویو کی ضرورت نہیں۔ مختصراً یہ کہ عالمِ انسانیت اور دنیائے عرب

کی خرابیٔ احوال اپنی جگہ، مصر کے حالات بہت خراب تھے۔ لادین قوم پرست، انگریزی اقتدار کی چالیں، قبطی صلیبوں کا انگریزی شہ پہ شرانگیزی کرنا، نتیجتاً خانہ جنگی، حکمرانوں کا نفاق، تجدد پسندوں کی روش، مغربی تہذیب و معاشرت کی یلغار، تفریقِ دین و سیاست، خاتمۂ خلافت، آزادیٔ نسواں، اسلام کے لیے معذرت خواہانہ رویہ، عرب قومیت کا نعرہ (بلکہ فرعونیت کی لہر)، قدیم و جدید کی جنگ، لہو و لعب کا طوفان، ملحدانہ اور اسفل ادب کا فروغ ــــ یہ تھیں بلائیں جن میں مصر گھرا تھا اور کچھ اُمید نہیں ہوتی تھی کہ سلامتی کا کوئی راستہ نکلے گا۔

وہ راستہ حسن البناء کی شکل میں نکلا، جنہوں نے دلسوزی کے ساتھ، مگر صبر و حکمت سے دعوتِ حق کا کام شروع کیا۔ اور وہ ڈگر چھوڑ دی کہ دین کی آواز ہمیشہ مساجد کے حلقوں سے بلند کی جاتی تھی۔ انہوں نے دعوتِ حق کا کام قہوہ خانوں، ہوٹلوں اور تنوروں کے مجمعوں سے شروع کیا۔ پھر یہ ڈائری اوّل سے آخر تک ان کے دعوتی تجربات اور عجیب عجیب واقعات اور کرداروں کو سامنے لاتی ہے۔ یہ تفاصیل پڑھ کر ہی معلوم کریں۔

خطباتِ بہاولپور | از جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب (مقیم پیرس) ناشر برائے اشاعت سوم: ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد، پوسٹ بکس نمبر ۱۰۳۵، پاکستان۔ بڑی تقطیع پر (۲۶ سطر فی صفحہ) ٹائپ سے سفید کاغذ پر چھپائی۔ ۴۶۶ صفحات کا یہ مجموعۂ تقاریر ہے، جو خطباتِ مدراس کی طرز کی چیز ہے۔ افسوس ہے کہ اتنی بھاری کتاب پر دبیز کارڈ کا ٹائیٹل لگا ہوا ہے۔ قیمت ۱۵۰/- روپے۔

میں تمہیدی فقرے میں یہ ذاتی تاثر بیان کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ میری پسندیدہ علمی و دینی بزرگ شخصیتوں میں سے ایک ہیں۔ اور میں انہیں دورِ حاضر کے آسمانِ تاریخِ ملت پر ایک درخشاں ستارے کی صورت میں دیکھتا ہوں۔

بہاولپور یونیورسٹی کی دعوت پر ڈاکٹر صاحب کے دیئے ہوئے یہ ۱۲ خطبات جو اس مجموعے میں ہیں، ایمانی شعور اور فہم دین کے لیے بہت مفید ہیں ــــ موضوعات بہت اہم

ہیں: ۱۔ تاریخ قرآن مجید ۲۔ تاریخ حدیث شریف ۳۔ تاریخ فقہ ۴۔ تاریخ فقہ واجتہاد ۵۔ اسلامی قانون بین الممالک ۶۔ دین (عقاید، عبادات، تصوف)۔ ۷۔ عہدِ نبویؐ میں مملکت اور نظم ونسق ۸۔ عہدِ نبویؐ میں نظام دفاع اور غزوات۔ ۹۔ عہدِ نبویؐ میں نظامِ تعلیم ۱۰۔ عہدِ نبویؐ میں نظامِ تشریع و عدلیہ ۱۱۔ عہدِ نبویؐ میں نظامِ مالیہ و تقویم ۱۲۔ عہدِ نبویؐ میں تبلیغ اسلام اور غیر مسلموں سے برتاؤ۔ ہر لیکچر کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ ہے۔ آخر میں کتابیات کی فہرست ہے نیز اشاریہ۔ کتاب میں نقشے بھی ہیں اور حضورؐ کے خط کا عکس بھی۔

عنوانات کو دیکھیں تو پورے اسلامی نظام پر حاوی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھے ہوئے مقالے پڑھنے کے بجائے عام طریق سے خطاب کیے ہیں۔ مسائل، اشخاص، کتب، علوم قرآن و حدیث و فقہ کی ترقی پر ایسے خوب صورت انداز میں گفتگوئیں کی ہیں کہ کسی ادبی نگارش کی طرح پُرلطف لگتی ہیں اور پڑھنے والے کو محسوس ہوتا ہے کہ خود ڈاکٹر صاحب اس کے سامنے تقریر کر رہے ہیں۔ طریقِ تفہیم بہت ہی سادہ اور مؤثر ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے خاص طور پر زور دے کر بتایا ہے کہ کتابِ الٰہی کی کتابت، تدوین و ترتیب اور اس کی حفاظت کے انتظامات اور تمام اُمت کو ایک قرات اور ایک مرکزی نسخے پر جمع کر دینا کہ آج تک ایک شوشے کی تبدیلی بھی نہیں ہو سکی، حیرت ناک کارنامہ ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ اُصولِ فقہ یا اُصولِ قانون کا علم دُنیا بھر میں کسی قوم نے پہلے مدون نہیں کیا تھا۔ یہ کام بھی صرف مسلمانوں کا کیا ہوا تھا۔ اسی طرح معیاری شکل میں قانون بین الممالک کی تدوین کا سہرا بھی مسلمانوں کے سر ہے۔

میں نے بہت غور سے دیکھا کہ اس دَور کی ناوک اندازیوں کا نشانہ بننے والے اہم مسائل میں ڈاکٹر صاحب کا موقف بڑا مضبوط ہے۔ حتیٰ کہ رجم، امام مہدی، سُود، ڈاڑھی، غلامی وغیرہ مسائل پر ڈاکٹر صاحب نے اچھی رہنمائی دی ہے۔ بلکہ سُود کی حرمت کے بھی وہ قائل ہیں، مگر ایک مقام پر اُلجھن ہوئی۔ ص ۱۱۳ پر یہ ہے کہ "اگر ایسے بینک کا سُود ہو جس میں قرض دہندہ اور قرض حاصل کنندہ، دونوں منفعت اور خسارے

میں برابر کے تناسب سے شریک رہنے پر آمادہ ہوں تو وہ ربوا نہیں "۔ عملاً یہ خوب صورت الفاظ جامۂ عمل نہیں پہن سکتے۔ یہ بھی سوچتا رہا کہ کیا ہم مکّہ کے دورِ دعوت و ہجرت کے رسم و رواج کو اس وقت کی شریعت اسلامی کا ماخذ قرار دے سکتے ہیں؟ (ص ۸۸) میرا خیال ہے کہ دورِ ابراہیمیؑ کے باقیات اور معروفات میں سے جس چیز کو قرآن اور نبی قبول کرلیں وہ اس کے بعد سے شریعت میں شامل ہوں گی۔ فی نفسہٖ شریعت کا ماخذ کہنا غیر ضروری ہے۔ عورت کی نبوت پر یہ کہنا کہ ایک طرف خدا کا حکم ہے، دوسری طرف یہودیوں کا بیان، لہٰذا میرے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہے؟ کیوں مشکل ہے صاحب! آپ سیدھے سیدھے خدا کا ساتھ کیوں نہ دیں۔ (ص ۱۳۱) قرآنی مثال شجرۂ طیبہ کا اطلاق اسلامی فقہ پر اچھا لگا۔ (ص ۸۵)۔ اُم ورقہ کی امامت والا قصہ بڑدئے تحقیقِ حدیث درست نہیں بہ حیثیت مجموعی دین کا علم اور دین کی محبت دینے والی بہت قیمتی کتاب ہے۔

پہاڑوں کا بیٹا از جناب ملک احمد سرور صاحب۔ ناشر: مکتبۂ ہمدرد ڈائجسٹ ۲۴، چیمبرلین روڈ، لاہور۔ اسٹاکسٹ: البدر پبلیکیشنز ۲۳۔ راحت مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور۔ سفید کاغذ پر صاف ستھری طباعت، دبیز آرٹ کارڈ کا رنگین ٹائیٹل۔ ص ۲۴۶۔ قیمت: ۴۵/- روپے۔

نوجوانوں کے لیے لکھے گئے اس عوامی ناول کو پڑھ کر میں بہت خوش ہوا۔ فن کی مروجہ باریکیوں کی ایسے لٹریچر میں اتنی اہمیت نہیں ہوتی، جتنی ان واقعات و کردار کی سادہ تصویر کشی کی ہوتی ہے جن کی کڑیاں جڑنے سے ناول بنتا ہے اور ناول کی وحدت کو ایک یا چند مستقل کردار اور علت و معلول یا مہمات اور نتیجہ کا تسلسل قائم کرتا ہے۔ اس ناول کی ریڑھ کی ہڈی علی کا کردار ہے جو مجاہد سپاہی سے ترقی کر کے اپنی بہادری اور جنگی حکمتِ عملی کی مہارت۔ اور عملی کارناموں کے ذریعے کمانڈنگ پوزیشن تک پہنچا۔ علی ناول کے آسمان پر لہراتی ہوئی بجلی محسوس ہوتا ہے۔ یہاں کڑکی، وہاں چمکی، ادھر گری

یا دُور کہیں آسیبوں اور چڑیلوں کے لشکروں کو پھونک ڈالا۔

کمانڈر علی کا طاہرہ سے اور عبدالرحمٰن (روسی مسلمان) کا زبیدہ کے درمیان بڑے پاکیزہ طریق سے دل کو دل سے ربط ہو جاتا ہے۔ اور ملک احمد سرور صاحب بغیر مروّجہ جنسی ہیروئن کے چٹخاروں کے اسے رومانس کے بجائے حیادارانہ طریق پر مناکحت کی منزل تک لے جاتے ہیں۔ روسیوں کے مظالم کے مناظر، مجاہدین کی سرفروشانہ کارروائیوں کی رُوداد یں، نت نئی مشکلوں کا پیش آنا اور مشوروں سے ان کا حل نکالنا، مجاہدین کا قیدی علی کو کابل سے چھڑا کر لانا، دریائے آمو پار کر کے روسی مسلم علاقے میں داخلہ اور وہاں کے حالات کا تذکرہ، نیز وہاں قلوب میں جہاد کی بارودی سرنگوں کی موجودگی کا احساس، قرآن کے نسخوں کی بہترین تحفوں کی حیثیت سے تقسیم — آدمی ناول نگار کے ساتھ ساتھ نجانے کہاں کہاں تک گھوم آتا ہے۔

ایسی چیزیں ضرور لکھی جانی چاہئیں — اعلیٰ سطح کی بھی، اور عوامی سطح کی بھی، تاکہ لادینیت پرستی، غلامئ مغرب اور خواہشات و لذات کی اسیری اور جنسی چٹخاروں کے مزبلہ خانوں سے دماغوں کو اُوپر اُٹھایا جا سکے۔

SUNSHINE AT MADINA

از جناب زکریا بشیر صاحب۔ ناشر: اسلامک فاؤنڈیشن،
MARKFIELD, (UNITED KINGDOM)
LEICESTER LE6 ORN

الحمدللہ کہ سیرتِ نبویؐ کے چمن زار میں روز بروز نئی کیاریوں کا اضافہ ہو رہا ہے۔ اور آج کے دَور کا انسان سیرت و حدیث کے لفظی تصاویر کے البم اور حضورؐ کی شخصیت اور کردار سے متعلق واقعاتی مدّوجزر کے ذریعے اتنا تفصیل سے جان سکتا ہے۔ گویا کہ وہ بالکل پاس بیٹھا ہو یا ساتھ ساتھ چل رہا ہو۔ "مدینہ میں درخشانیٔ آفتاب" بھی علمی سطح پر ایسا ہی ایک حقیقت نما فلم پیش کرتی ہے۔

پہلے میں نے جستہ جستہ کتاب کو دیکھا، بعض خاص نکات پر نگاہ ڈالی، پھر خورشید صاحب کا زوردار (زبان اور مطالب دونوں لحاظ سے) FORWARD پڑھا اور اسے پڑھ کر خیال ہوا کہ اسی مقالے کی چند سطریں تعارفی تبصرے کے لیے کافی ہیں۔ پھر مؤلف کا مقالہ تعارف کتاب پڑھا۔ اور اندازہ ہوا کہ کتنے وسیع مطالعے کے ساتھ کام کیا گیا ہے۔ خصوصاً اس کتاب کی انگریزی زبان نے تو مجھے والہیت میں بتلا کر دیا۔ مؤلف نے مآخذ پر جو گفتگو کی ہے وہ بہت ضروری اور قیمتی ہے۔

یہ طویل اور اصل مبحث بڑا توجہ طلب ہے کہ فاضل مؤلف نے محمدی معاشرہ کے ستون شرح و بسط سے سمجھائے ہیں۔ حضورؐ سے متعلق دو دستاویزات پر تفصیلی بحث کی ہے۔ ایک "صحیفہ" وہ دستاویز جو مدینہ کے مختلف قبائل اور مذاہب کو ایک مرکز سے وابستہ رکھ کر چلنے کے لیے تحریری طور پر تیار کی گئی۔ اور سب سے تائید حاصل کی گئی۔ دوسری خطبۂ حجۃ الوداع۔

حضورؐ کی حیاتِ خانہ داری اور ازواجِ مطہرات کے اہم مبحث پر معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

مصنف سیرتِ مطہرہ کے میدان میں حضورؐ کے مکّی دَورِ دعوت و محنت اور ہجرت پر پہلے لکھ چکے ہیں۔ اب پیشِ نظر کتاب آئی ہے۔ خورشید صاحب نے آخری بحث جہاد و غزوات پر لکھنے کا مشورہ دیا ہے۔ اور میرا مشورہ یہ ہے کہ آخری کتاب اسلام کے اصولِ عدل اور حضورؐ کی اخلاقی انصاف پسندی اور عدالتی دائرے میں معدلت گستری اور اسلامی قانون کے تفوق کو نمایاں کیا جائے۔

یہ کتاب نہ صرف تحریکی انداز اور اہلِ مغرب کے لیے بہترین انگریزی زبان اور ترتیبِ مباحث میں وجوہِ کشش رکھتی ہے، بلکہ اس کا معیارِ تحقیق بھی مغربی مسلّمہ معیارات سے کم نہیں۔ بات بات پر اسلامی مآخذ میں سے اقتباس پیش کر کے استدلال کیا ہے۔ آخر میں نوٹس اور حوالوں کا خاص اہتمام ہے۔ نیز دَورِ جدید کے تقاضوں کے مطابق نہایت اچھا انڈکس شامل کیا گیا ہے۔

افسوس ہے کہ جگہ کی قلت کی وجہ سے ہم نہ اس کتاب کے اچھے اچھے مندرجات کو پیش کر سکتے ہیں، نہ اخلاقی نکات پر بحث کر سکتے ہیں۔

ترکی کا مردِ مجاہد | تصنیف ڈاکٹر سعید رمضان البوطی - ترجمہ از مولینا خلیل حامدی - ناشر: ادارہ معارف اسلامی، منصورہ - لاہور - تقسیم کنندہ: المنارہ بک سنٹر، منصورہ ملتان روڈ، لاہور - کوڈ ۵۴۷۰ -

مشرق و مغرب کے درمیان ایک پُل کی طرح قائم ترکی بڑی اہمیت کی مُسلم سلطنت ہے - جہاں اسلام اور مغربیت اور سیکولرازم اور آمریت کی شدید کشمکش کی لمبی تاریخ ہے - یہاں جن ہستیوں نے انور پاشا کے بعد لادینی آمریت کے پتھروں کو توڑ توڑ کر دعوتِ اسلام کے لیے راستہ بنایا، ان میں بڑا ممتاز مقام بدیع الزمان سعید نورسی کا ہے - ترکی قوم اور نوجوانوں میں بیداری پیدا کرنے کے لیے اس مجاہد نے مخالفتوں اور قید و بند کے باوجود بڑی عرق ریزی سے کام کیا ہے۔ اس کی روداد لکھنے والا بھی صاف دل ہے اور ترجمہ کرنے والے صاحب بھی متاعِ سوز و ساز رکھتے ہیں۔

گلشنِ اقبال | مصنّف: پروفیسر اسرار احمد خاں سہاوری - ایم اے - ناشر: محمد انور خلیلی - ملنے کا پتہ: دارالاشاعت ادارۂ تنظیم مساجد ۱۱۵ - سی سٹیلائٹ ٹاؤن، گوجرانوالہ قیمت: ۱۵/۰ روپے -

میرے محترم دوست، بھائی، ادیب، شاعر، معلّم، دانش ور ساری عُمر تعمیری و فلاحی ادب کی خدمت کرتے رہے اور اب بھی وہ خون اور پسینے کی آخری بوندیں اسی سفرِ عشق میں کھپا رہے ہیں - میرے دل میں ان کی بڑی قدر ہے - مگر جب کتابوں کا ڈھیر (اس وقت بھی یک صد کتابیں برائے ریویو ہوں گی) دیکھتا ہوں تو ہر مرتبہ جن اپنوں کی

خدمت کو مؤخر کرنا چاہتا ہوں، بلا تکلف کر دیتا ہوں ۔ اور ایک بار نہیں، تین تین بار ۶، ۶ مہینے ۔ میری اس کوتاہی کے ایک خاص مجروح پروفیسر صاحب ہیں ۔ اور آپ نوان کی کتاب ہاتھ میں لی تو دیکھتا ہوں کہ جگہ اتنی کم ہے کہ پہلے ہی سے شرمندہ ہوں ۔ میں صرف چند لفظوں میں بات کروں گا کہ ۱۳۶ صفحے کی کتاب میں پروفیسر صاحب نے فہم اقبال، تفہیم اقبال اور محبتِ اقبال کا حق ادا کر دیا ہے ۔ جس شخص نے ساری عمر اقبال کی فکر، شاعری اور اس کے ذوقِ جمال کی غواصی کی ہو، اب وہ کسی زیادہ بحث و تجربہ کا محتاج نہیں ۔ عشق کے معاملے "بحرفے می تواں گفتن" والے ہوتے ہیں ۔

خیال فرمایئے، یہ جنوری ۱۹۸۹ء کی مطبوعہ کتاب ہے ۔ ہماری بے تکلفی بھی حد سے گزر گئی ۔

ہندوستانی سماج اور دعوت اسلامی | اشاعت خاص ماہنامہ رفیق منزل ۔
مدیر اعزازی منور حسین فلاحی ۔ دفتری امور: منیجر رفیق منزل، ۲۳۰-۱ ابو الفضل انکلیو، اوکھلا ۔ نئی دلی ۔ ۱۱۰۰۲۵ (انڈیا) ۔ اس خاص نمبر کی قیمت: ۱۵/ روپے ۔ سالانہ چندہ ۲۵/ روپے ۔

درسی کتابی سائز کے اس رسالے کا پیش نظر خاص نمبر بڑے اہم مضامین پر مشتمل ہے ۔ ان پر تفصیلی گفتگو تو نہیں کی جا سکتی، البتہ عنوانات سے آپ اندازہ کر لیں ۔ ۱ ۔ جدید ہندو مذہبی تحریکات ۲ ۔ احیا پسند ہندو طلبہ تنظیمیں ۳ ۔ کمیونسٹ طلبہ تنظیمیں ۔ ۴ ۔ ہندوستان میں تہذیبی جارحیت ۵ ۔ مسیحیت ۶ ۔ بھارتی سیکولرازم ۷ ۔ ہندوستان کے دینی مدارس ۸ ۔ اسلام کا روحانی نظام ۹ ۔ مسلم جماعتوں کا سیاسی طریق کار ۔ ۱۰ ۔ اسلام میں رخصت و عزیمت کے تصورات ۱۱ ۔ اسلامی تہذیب و تمدن کا تحفظ ۔ ۱۲ ۔ تربیت اور اس کے ذرائع ۔ ۱۳ ۔ تحریک اسلامی ہند ۔

کاش کہ کوئی صاحب تفصیل سے پڑھ کر، غیر ضروری یا اسلام کے متعلق انتشار انگیز اختلافی عنصر کہیں پائیں تو بعض حصص کو چھوڑ کر منتخب مضامین پر مشتمل ایک کتاب مرتب کر کے پاکستان سے شائع کر دیں ۔

اسلام کے بنیادی اصول | از شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب بن سلیمان التمیمی۔
اس پمفلٹ میں ایک مبحث دین اسلامی۔ کے ۳ قاعدے بھی شامل ہیں۔ ترجمہ: سید محمد غیاث الدین۔ ناشر: ادارۂ طباعت واشاعت، ریاض، سعودی عرب۔ کاغذ، طباعت، ٹائیٹل عمدہ، صفحات: ۸۵۔ مفت تقسیم۔

شبہات کا ازالہ | از شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب۔ ناشر: ادارۂ طبع و ترجمہ ریاض۔ مملکت سعودی عرب، کاغذ، طباعت، ٹائیٹل عمدہ، صفحات: ۳۷
مفت تقسیم۔

رشوت اور سفارش | سید محمد رضا۔ ناشر: ڈار پبلی کیشنز۔ پوسٹ بکس ۸۰۰۵ کراچی ۳۔ طبع چہارم۔ بربنائے عقیدت بے نظیر صاحب کے نام معنون۔ قیمت نامعلوم۔

مکافات عمل | سید محمد رضا۔ ناشر: ڈار پبلی کیشنز، پوسٹ بکس ۸۰۰۵ کراچی ۳۔
قیمت نامعلوم۔

محمد اکرم قریشی کے پمفلٹ | ۱۔ جماعت اسلامی کی سیاسی پالیسی۔ ناشر: شعبۂ نشر واشاعت جماعت اسلامی پاکستان۔ ۲۔ اقامت دین ۳۔ دین مصطفےٰ ۴۔ نظام مصطفیٰ ۵۔ میں پردہ کیوں کرتی ہوں ۶۔ اولیائے چشتیہ کا نامور فرزند ۷۔ استحصال اور غربت کیوں؟
آخری ۶ پمفلٹ نذیر شہید اکیڈمی۔ جلال پور جٹاں، ضلع گجرات کے شائع کردہ ہیں۔ قیمتیں درج نہیں۔

عورت کی حکمرانی | از مولانا زاہد الراشدی۔ ناشر: الشریعہ اکیڈمی پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳۔ گوجرانوالہ۔ ماہنامہ "الشریعہ" کا ایک شمارہ ہے اور ایک ہی مبحث پر مشتمل ہے۔ افسوس کہ قوم کے اعصاب پر تو عورت سوار ہے۔

عورت کی سربراہی کا مسئلہ تالیف: حافظ صلاح الدین یوسف مدیر "الاعتصام"۔ باہتمام دار الدعوۃ السلفیہ، شیش محل روڈ۔ لاہور ۲۔ کمپیوٹری طباعت قیمت درج نہیں۔

عورت کی سربراہی عملاً تو عذاب بن کر ہمارے سر پڑ گئی ہے مگر ہمارا ایمان اس کے خلاف آواز بلند کر رہا ہے۔ حافظ یوسف صاحب نے بڑے فاضلانہ طریق سے اس بحث کے مختلف پہلوؤں کو سمیٹا ہے۔ حافظ صاحب نے متنقد و معترضین کی بحثوں کے خوب عالمانہ جواب دیئے ہیں۔ خصوصاً میں ام ورقہ والے مسئلے میں ڈاکٹر صاحب [illegible] الجھا ہوا تھا۔ خوشی ہوئی کہ آپ نے اس کی حقیقت کھول دی۔ میرا خیال ہے کہ یہ اس مسئلے پر بہت جامع تحریر ہے۔ خدا جزا دے۔

رہنمائے حج و عمرہ و زیارت مسجد نبوی ترجمہ: محمد لقمان سلفی۔ ناشر: ادارۂ طبع و ترجمہ ریاض، سعودی عرب۔ کاغذ، طباعت، ٹائیٹل عمدہ۔ جیبی سائز۔ صفحات: ۵۵۔ مفت تقسیم۔

معرکۂ اسلام اور سرمایہ داری

از سید قطب شہیدؒ

ترجمہ:

پروفیسر میاں منظور احمد ایم۔ اے

- سرمایہ داری انسانی معاشرے کی خون پینے والی جونک ہے۔
- سرمایہ داری، ظلم، خونخواری اور برادرکشی کا نام ہے۔
- سرمایہ داری، نفس پرستی، مفاد پرستی اور زر پرستی کا مظہر ہے۔
- اسلام، خالقِ کائنات کا عدل و انصاف پر مبنی نظامِ حیات ہے۔
- اسلام، ربّ العٰلمین کا نظامِ ربوبیت ہے۔
- اسلام، کمزوروں ضعیفوں، مجبوروں اور لاچاروں کا پشت پناہ اور دستگیر ہے۔
- وہ سارے مسائل جو سرمایہ داری نے پیدا کیے ہیں ان کا حل اشتراکیت نہیں اسلام میں ہے۔
- وہ سارے مسائل جو طبقاتی تصادم اور ظلم و ستم کا باعث ہیں اسلام کی اخوت و مساوات اس کا حل ہے۔
- معرکۂ اسلام اور سرمایہ داری میں دونوں کا گہرا مطالعہ کیجیے۔

قیمت: ۲۴ روپے

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اردو بازار، لاہور

REGD NO L 5340 PHONE : 324468

MONTHLY **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE

جاری کردہ: مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی

ماہنامہ

ترجمان القرآن

روداد اجتماع عام

- افتتاحی خطاب
- کلیدی خطاب
- خطاب جلسہ عام
- اختتامی خطاب

قاضی حسین احمد
امیر جماعت اسلامی

اعلامیہ

رپورٹ جماعت اسلامی پاکستان
۸۳ — ۸۹ء

اجتماع عام نمبر
۸۹ء

مئی [illegible] ۹۰ء

دیگر تقاریر:

- درس قرآن و حدیث
- ایمان اور دعوت و جہاد
- جماعت [illegible]
- پاکستان میں جماعت کا کردار
- خواتین کا کردار
- نوجوانوں کا کردار
- ہم کیا معاشی تبدیلیاں لانا چاہتے ہیں
- بین الاقوامی مندوبین

ٹائیٹل دیدہ زیب

کتابت کمپیوٹرائزڈ

ضخامت غیر معمولی

مقررین

- مولانا جان محمد عباسی
- پروفیسر غفور احمد
- چودھری رحمت الٰہی
- پروفیسر خورشید احمد
- خرم مراد
- مولانا گوہر رحمٰن
- مولانا فتح محمد
- مولانا عبد الحق
- حافظ محمد ادریس
- لیاقت بلوچ
- سید منور حسن

قیمت: -/۳۰ روپے

اِدارہ ترجمان القرآن (پرائیوٹ) لمیٹڈ - اردو بازار لاہور
فون: ۳۲۴۴۶۸ — ۶۸۶۳۶ ○ پوسٹ بکس نمبر ۳۴۳